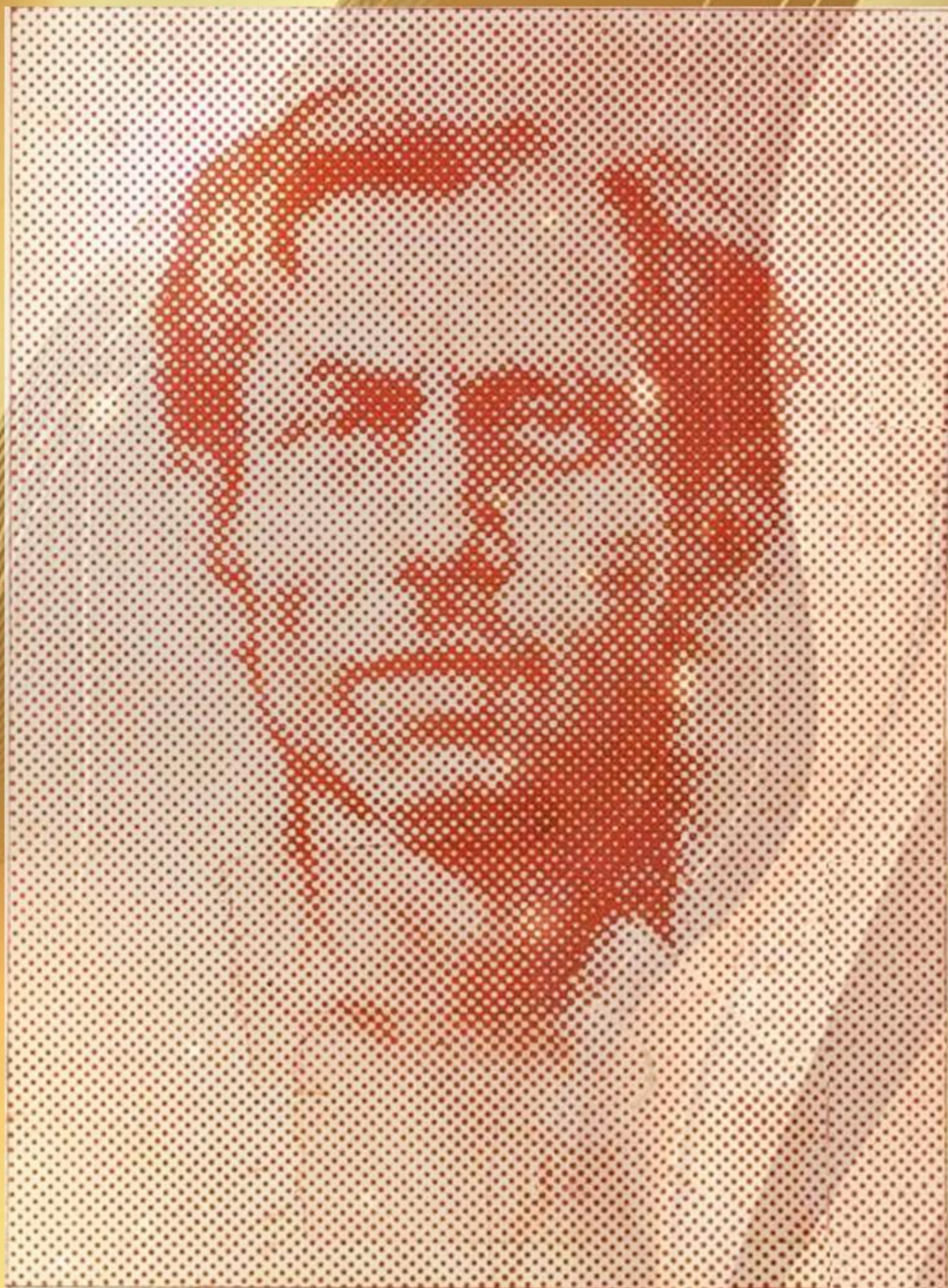


ناصر کاظمی: شخصیت اور فن



ناصر کاظمی

ناصر کاظمی شخصیت اور فن

ناہید قاسمی

فضل حق اینڈ سنز پبلیشرز لاہور

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار : ——— نومبر ۱۹۹۰ء

تعداد : ۵۰۰

ناشر : ——— طلعت حق خان

قیمت : ——— ۸۵ روپے

مقام اشاعت : ——— فضل حق اینڈ سنز

پبلشرز اینڈ پرنٹرز،

دربار مارکیٹ لاہور۔

انتساب

اپنے پیارے ابا جی اور اپنی پیاری امی جی کے نام
جن کی دعاؤں کی روشنی میں مجھے لفظ لکھنا سیکھنے
کی سعادت نصیب ہوئی۔

عہد بگیرا میں ہمہ سرمایہ بہارا انہ من

فہرست

- | | |
|-----|---|
| ۶ | ۱ — پہلی بات |
| ۹ | ۲ — پہلا باب حالاتِ زندگی اور شخصیت |
| ۶۰ | ۳ — دوسرا باب اُردو و غزل - قیامِ پاکستان تک |
| ۹۱ | ۴ — تیسرا باب غزل کی حیات نو - اور ناصر کاظمی |
| ۱۲۵ | ۵ — چوتھا باب ناصر کی غزل کے اہم پہلو |
| ۱۷۳ | ۶ — پانچواں باب ناصر کی نظم اور شکر کا جائزہ |
| | و — نظم |
| | ب — منثر |
| ۲۲۰ | ۷ — چھٹا باب ”ہر دور کی غزل میں میرا نشان ملے گا“ |
| ۲۳۶ | ۸ — کتب و رسائل کی فہرست |

پہلی بات

خود ستائی کے الزام کا خطرہ مول لے کر بھی میں اس مقالے کے حوالے سے یہ بتانا اپنا حق اور فخر سمجھتی ہوں کہ میں احمد ندیم قاسمی کی بیٹی ہوں۔ یوں گھر میں بھی مجھے شعروادب کا ستھرا ماحول میسر آیا اور اپنے اس مقالے کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے کے لئے بھی اپنے آبا جی کے توسط سے مجھے ناصر کاظمی کے گھر کے علاوہ ان کی غیر مطبوعہ اور نا در تحریروں تک بھی رسائی حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی شاید بیکار نہ ہوگی کہ میں خود بھی ایک چھوٹی سی... بالکل چھوٹی سی شاعرہ ہوں۔ بی۔ اے تک میں نے اُردو ادب کے ساتھ فائن آرٹس کا مضمون لے رکھا تھا مگر ایم۔ اے اُردو میں دخلہ یہ سوش کر لیا کہ اگر میرے اندر شاعری کا جوہر واقعی موجود ہے تو اس طرح اُسے نکھرنے کا موقع ملے گا اور حق بات یہ ہے کہ ناصر کے فن اور شخصیت پر یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر میں اپنے اندر ایک روشنی سی محسوس کرتی ہوں۔

میں نے ناصر کاظمی کی غزلیں پہلے بھی کئی بار پڑھی تھیں اور آبا جی سے ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں کئی باتیں بھی سُنی تھیں لیکن یہ بات میرے دہم و گمان

میں بھی نہ تھی کہ ایک روز مجھے ناصر کاظمی کے سے شاعر پر مقالہ لکھنے کا اعزاز حاصل ہوگا۔ چنانچہ جب یہ خوشگوار کام میرے سپرد ہوا تو میں نے اس وقت تہیہ کر لیا کہ میں محنت اور ریاضت کی انتہا کر دوں گی اور میرے اندر فن سے عتنی بھی لگن ہے اسے یہ مقالہ لکھنے کے کام میں لاؤں گی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو میں نے ناصر کے کلام سے دوستی بڑھائی۔ یوں آہستہ آہستہ ان کا کلام میرے احساس، جذبات اور فکر پر سادوں کی نرم پھوار کی طرح برسا اور جذب ہوتا رہا، اور میں نے قلم اس وقت اٹھایا جب میں نے ان کی شخصیت اور فن کو ممکن حد تک جان لیا۔ اب یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ میں اس جان پہچان میں کتنی کامیاب رہی ہوں۔

اس مقالے کے لئے میرے نگران استادِ مکرم سید سجاد باقر رضوی صاحب ہیں جو ناصر کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ناصر کے بارے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے میں نے ناصر کو ہمیشہ جیتا جاگتا محسوس کیا۔ سجاد صاحب نے جو توجہ مجھے دی اور جو محنت مجھ پر کی اس کا شکریہ تو شاید میں مناسب الفاظ میں ادا کر سکنے کے قابل ہو ہی نہیں سکتی لیکن میں ان کی اس عنایت کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی کہ ناصر کے سلسلے میں ان کی اور میری سوج میں کئی بار اور کئی مقام پر اختلاف بھی ہوا، جو اب بھی ہے لیکن انہوں نے کسی بھی لمحے اپنی رائے مجھ پر مسلط نہ کی بلکہ جب میں نے اپنی بات کہی تو انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے خیال میں یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسے شفیق نگران ملے جنہوں نے مجھے اتنی آزادی دی کہ میں خود راہیں ڈھونڈ کر منزل تک پہنچوں، نہ کہ وہ ہمیشہ ہر لمحے میری انگلی ہی تھامے رہیں۔ میرے آجی نے مجھے شعر و ادب کے سلسلے میں جو آزادی دے رکھی تھی وہ میرے محترم نگران کے تعاون سے میری خود اعتمادی میں بدل گئی۔

میں بیگم ناصر کاظمی اور ان کے دونوں صاحبزادوں باصیر سلطان کاظمی اور حسن سلطان

کاظمی کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے میری دستگیری کی اور ناصر کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں مجھے دکھائیں اور ناصر کے انتہائی اہم ٹی۔وی انٹرویو کی نقل بھی مجھے دی۔ میں ناصر کاظمی کے احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے خطوط کے جواب بھی لکھے اور ملاقات کے لئے قیمتی وقت بھی دیا۔ یہاں میں اپنے ایک اور محترم استاد کا بھی شکر یہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ یہ محترم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب ہیں جنہوں نے مقالے کی تیاری کے دوران میں مجھے ذرا سا بھی سست ہوتے دیکھا تو فوراً خبردار کیا اور بہت شفقت سے میرے مقالے کی کامیابی کی دعا کی۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے شوق کے علاوہ سجاد صاحب، صدیقی صاحب، آبا جی اور خود ناصر کاظمی کے لئے بھی میں نے اس مقالے کو ہر پہلو سے مکمل کرنے کی سعی کی اور یہ مقالہ اس احساس کے ساتھ لکھا کہ ناصر پر مستقبل میں چاہے جو سمجھ بھی لکھا جائے لیکن اس موضوع پر ”حرف آغاز“ کا اعزاز میرے ہی حصے میں آیا۔

ناہیدہ قاسمی

ستمبر ۱۹۷۴ء
یونیورسٹی اور نیشنل کالج، لاہور

حالاتِ زندگی اور شخصیت

اکثر کہا جاتا ہے کہ شاعر فطرتاً شاعر ہی ہوتا ہے، یعنی فنِ شاعری سیکھنے سے عام آدمی شاعر نہیں بن سکتا۔ یہ بات تو درست ہے کہ کسی کی موزونِ طبع، شعر کا بظاہر خوبصورت جسم تو شاید ڈھال لے لیکن اس میں ایک زندہ، مچلتی ہوئی روح نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے کہ اصل شاعر اپنے گرد و پیش اور تجربات سے کچھ حاصل کئے بغیر اور اپنے سے پہلے کے اور اپنے زمانے کے شاعروں کے کلام کی خوبیوں، خامیوں کو جانے بغیر بھی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ بے شک شاعری کا جوہر ہی اصل چیز ہے مگر اس جوہر کو نکھارنے کی ضرورت تو بہر حال ہوتی ہی ہے۔ یہ جو مشہور مصور مائیکل اینجلو نے کہا تھا کہ بُت تو پتھر ہی میں بچتا ہے اور میرا کام تو فالتو پتھر کو تراش کر الگ کر دینا ہے، تو اس فالتو پتھر کو تراشنے کے لئے بھی تو ٹھنڈی ضرورت ہے ورنہ محض پتھر تراشنے سے حُسن کی بجائے بد صورتی بھی تو جنم لے سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر بھی انسان ہوتا ہے (شاعر سے مراد یہاں ظاہر ہے ایک اچھا، کامیاب اور مکمل شاعر ہی ہے) عام انسان اور شاعر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ شاعر دوسروں کی نسبت زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے۔ وہ بات کی تہہ تک دوسروں کی نسبت جلد اور گہرائی تک اُتر سکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف، دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں

ان کے کچھ نہ کچھ ذرات شاعر کے خمیر میں ضرور شامل ہوتے ہیں بوسیقی، مصوری، نفسیات جیومیٹری، انسان شناسی، نجوم، سائنس، غرض بشری علوم۔ اور پھر مذہب کی طاقت، عقائد کی قوت۔ اب ہوتا یہ ہے کہ کسی میں کسی خاص علم کے ذرات زیادہ ہوتے ہیں اور کسی میں کم۔ اس کا باعث لازمی طور پر حصول علم کے وسائل اور تجربے ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے شاعر کو نہ صرف اظہار میں بلکہ ابلاغ میں بھی آسانی ہوتی ہے شاعر کی میں علم کے علاوہ شاعر کا تجربہ اور اس کے جذبہ و احساس بھی شامل ہوتے ہیں۔ شاعر ایک خاص معاشرے میں رہ کر جذبات و احساسات کی تہذیب کرتا ہے، گرد و پیش کے حالات سے اسے تجربے کا حصول ہوتا ہے اور پھر فن کا کتاب، یہ سب کچھ صحیح معنوں میں ایک بہتر اور زندہ رہ سکنے والی شاعری کو تخلیق کرنے کا سبب ہوتے ہیں۔ یہی سب کچھ، بظاہر عام انسان کو ایک شاعر بناتا ہے اور ایک شاعر کی شخصیت کے نقوش کا تعین کرتا ہے۔

جب ہم شعر پڑھتے ہیں تو ہم صرف ایک جذبہ، ایک احساس اور ایک فکر کو شناخت کرتے ہیں، شاعر کی اپنی شخصیت پس منظر میں جا کر دھندلا جاتی ہے۔ تب ہمیں وہ شعر صرف اپنی ملکیت محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر شاعر کے شعر اس کی ملکیت جان کر دیکھے اور سنے جائیں تو پھر ان کے مکمل ابلاغ اور ان کی ساری خوبیوں کو جاننے کے لئے اس کی شخصیت کو بھی پس منظر میں لانا ہوگا۔ شاعر کے کلام کا نقاد بھی شاعر کے تجربے کی شناخت کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

”نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادب کے ایک شاہکار کی تمام قوت اور پیچیدگیوں کو پوری طرح محسوس کر سکے۔ شاعر کی شناخت کا نقاد یہ جاننے کی بھی سعی کرتا ہے کہ شعر کی تخلیق

کرنے والا شاعر کن مراحل میں سے گزرا اور اس نے اپنے تخلیقی سفر میں کیا کیا منزلیں طے کیں۔ اس سلسلے میں وہ شاعر کی شخصیت کی تشکیل کے مراحل پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ اور انسان کی شخصیت اس کی پیدائش سے لے کر اس کی وفات تک مسلسل صورت پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اسی آئینے میں مجھے ناصر کاظمی کی زندگی اور شخصیت کے واضح نقوش دیکھنا اور پھر دکھانا ہیں۔

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں اپنی تاریخ پیدائش ”۸ دسمبر ۱۹۲۵ء بروز جمعہ“ لکھی ہے۔ ان کا نام ناصر رضا کاظمی تھا۔ اپنے نام ہی کے ایک حصے ”ناصر“ کو بعد میں انہوں نے اپنا تخلص بنایا۔ وہ انبالہ (بھارت) میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی وفات (۲ مارچ ۱۹۷۲ء) سے کچھ دن پہلے سلیوٹین والوں کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

انبالہ ایک ظہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے

میں ہوں اسی ٹٹے ہوئے قریے کی روشنی

تو وہاں سے میں ہجرت کر کے آیا تھا۔ وہاں میں نے جنم لیا۔ والد میرے فوج میں تھے ایک چھوٹا سا معاشرہ تھا۔ ہمارا گھر پرندوں، یادوں، بچوں، پھولوں، درختوں اور ننھی ننھی پچھڑی گلیوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں سب لوگ، امیر، غریب بڑے سکھ اور ان سے رہتے تھے اور بڑے بڑے علماء بھی رہتے تھے لیکن ایک عجیب بات تھی اس معاشرے میں کہ جو بظاہر غریب ننھے منے لوگ تھے ان کی عزت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ بڑے لوگوں کی بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ۔ ایک وثیقہ نویس اتنی عزت رکھتا تھا اس معاشرے میں جتنی شاید ایک وزیر یا امیر کبیر نہیں رکھتا تھا۔ پھر وہاں ایک سکول تھا چھوٹا سا، مسلم ہائی سکول، اس میں میں نے تعلیم پائی۔“

۱۔ ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائری نمبر ۱

۲۔ ڈی، وی، انٹرویو۔۔۔ انٹرویو لینے والے تھے انتظار حسین۔

ناصر شیعہ عقیدہ رکھتے تھے۔ اپنے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

”میرے دادا اسید شریف الحسن پولیس انسپکٹر تھے، اور نصیر پور، مگر پورہ اور راج گڑھ کے بہت بڑے زمیندار تھے اور انبالہ کے چند نامور تھیوں میں سے تھے۔ میرے والد اسید محمد سلطان نے بی۔ اے تک تعلیم اسلامیا کالج لاہور میں حاصل کی۔ نائب تحصیلدار اور سب انسپکٹر بھی رہے۔ لیکن ملازمت کی طرف سے ان کا دل اچاٹ تھا۔ گھوڑے، سواری کا انہیں بہت شوق تھا۔۔۔۔۔ نہایت ہی نمازی، عابد شب زندہ دار، مخلص، ایماندار تھے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت نایاب ہیں۔ لاہور میں ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کی صبح کو فوت ہوئے۔ مرتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ”ناصر میرا نام زندہ رکھے گا اور اردو ادب اس پر ناز کرے گا۔“

ناصر کے والد کے بارے میں ناصر کی خالہ کا کہنا ہے کہ وہ بہت نازک مزاج اور کھلی ہوا کے رہنے والے تھے اس لئے ہجرت کے بعد لاہور میں جب انہیں ایک تنگ سے مکان میں رہنا پڑا تو وہ خاصے پریشان ہوئے۔ بلکہ یہی مزاج تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی پرورش شہزادوں کی طرح سے کی تھی۔

اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں بتاتے ہیں:

”میرے بڑے بھائی حامد حسین محکمہ پولیس میں بلازم ہیں۔

پہلی والدہ سے ہیں۔ ان سے ایک بہن عمیدہ بانو بھی تھیں جو ۸ سال

۱۔ ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائری نمبر ۱۔

۲۔ ناصر کاظمی کی خالہ محترمہ صفی بی بی کی ایک تحریر۔

کی عمر میں قلبی حرکت بند ہو جانے سے انبالہ میں فوت ہو گئیں۔ وہ مجھے میری ماں سے زیادہ پیار کرتی تھیں، میرا ایک چھوٹا بھائی ہے عنصر رضا جو میری زندگی کا اب آخری سہارا ہے۔

ناصر اپنی شاعری میں یادوں کا بہت ذکر کرتے ہیں۔ یادیں جو گزرے ہوئے سہانے وقت کو دھندلے پردوں کے تھپے سے سامنے لے آتی ہیں۔ اس بجھے دنوں کے ڈھیر میں بچپن سے جوانی تک کا زمانہ سمٹا ہوا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بچپن سے جوانی تک کا یہ سہانا زمانہ کیا ہے اور کس طرح گزرا اور ناصر اسے کس کس طرح یاد کرتے ہیں۔ ناصر اپنی عام گفتگو اور رسالوں میں پھینپنے والے اپنے مکالموں میں بچپن کی یادوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ اس زمانے کی معصومیت بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل کر جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ بچپن میں حاصل ہونے والے معصوم تجربات، جذلوں، شعور اور احساس کو صدیوں پہلے گزر چکے زمانوں اور گزرنے والے زمانوں سے ملا دیتے ہیں۔ بچپن اور اس کے تجربات مشہور انگریزی شاعر ڈزورڈزورٹھ کی طرح ان کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس زمانے کی یادیں انہیں کبھی نہیں بھولیں:

”بچپن میرا جس کا میں نے تھوڑا سا پس منظر دیا، پاکستان میں آکر مجھے بہت یاد آتا رہا لیکن تمہیں پتہ ہے کہ یاد جو ہے، انسان کی۔ وہ ایک یاد جو ہوتی ہے، وہ موبہ مو آتی ہے۔ یاد انتخاب کرتی ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہیں جو دوبارہ بار بار آکر میرا راستہ دکتے ہیں اور حاضرِ نرم ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے۔“

بہت قریب سے آتی ہے، دور کی آواز“ لکھندیم

لے ناصر کی ڈائری نمبر ۱۔

۱۵۔ ٹی۔ دی انٹرویو

اہل ذوق تھے اس لئے ذہین ناصر کے ذوق کی تربیت ہوتی گئی اور اسے اچھے بُرے کی پہچان کرنا بھی آگیا۔۔۔۔۔ اس شانہ اور آرام دہ ماحول میں، جہاں بچوں کی ہر خواہش پوری کر دی جاتی ہو، بچے لا پرواہ اور بے نیاز بنتے جاتے ہیں۔ انہیں ریت کے ریزوں کی چمک متوجہ نہیں کرتی بلکہ ریت سے بنایا ہوا کسی کا گھر دیکھتے یا ڈھانے میں لطف آتا ہے۔ ان کی نظر ”تفصیل“ کو نہیں ”اختصار“ کو پسند کرتی ہے۔ ان کی نظر سطحوں پر ٹھہرتی جاتی ہے۔ رکتی بھی ہے تو کسی چمک دار شے پر یا کسی ناقابل حصول چیز پر، جسے پھر وہ حاصل کرنے کی ضد شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن ناصر ایسے ماحول میں رہنے کے باوجود، سمجھ دار ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد حساس بچہ بھی تھے۔ ان کی گھریلو تربیت کے مختلف مراحل کے اثرات میں ضد اور خود مرکزیت بھی شامل ہے۔ یہ شے آخر تک ان میں رہی لیکن ان کا دل نہ مردہ تھا نہ مردہ ہوا۔ چمکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والے اس صحت مند بچے کو جزئیات اور تفصیل سے بھی لگاؤ تھا اور اس کا صحت مند رویہ یہ تھا کہ وہ ہر چیز کے بارے میں غور بھی کرتا تھا۔ اب یہاں دیکھیے ریل کا شوق اور پھر سوچ۔۔۔۔۔ یہی سوچ بعد میں انہیں ریل کا استعارہ دے گئی:

” میری عمر اُس وقت تقریباً چار برس کی ہوگی، اُن دنوں ہم نوشہرہ میں رہتے تھے اور ریل گاڑی ہمارے گھر کے پیچھے سے گزرتی تھی۔ سارا دن گاڑیاں گزرتی رہتیں۔ لیکن شام ہوتی تو میں نانا کے ساتھ جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوتا اور ریل گاڑی کا اس وقت تک انتظار کرتا جب تک اسے دیکھ نہ لیتا۔ ایک دن نانا کو انا لے سے تار آئی اور وہ چلے گئے۔ اس دن میں شام کی گاڑی نہ دیکھ سکا۔ میں رات بھر نیند میں جاگتا رہا اور انجن ہمارے گھر کے صحن میں شنٹ کرتا رہا۔ اس دن ’پاگل‘ کا لفظ باجی سے میرے پہلے بار سنا۔۔۔۔۔

--- دوپہر کی خاموشی میں ریل گاڑی سے بہتر ساتھی مجھے کبھی نہ ملا۔ میں ہر روز دوپہر کو دیوار پر بیٹھا گھنٹوں گاڑی کا انتظار کرتا اور لوہے کے جھگلے کو دیکھتا رہتا۔ "اے

اس بچے کو ہر وہ چیز حاصل کرنے کا شوق ہے جو اس کو بھا جائے۔ اسے پسندیدہ چیز کو تڑپے سکے تو وہ خود اسے اپنانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہے۔ اپنی مرضی کو پورا کرنے کی راہ میں اُسے جو رکاوٹ محسوس ہو وہ اسے ہٹا دینے کی سعی کرتا ہے! اسے وقت کی پابندی سب سے زیادہ ناگوار رہی۔ اسکول جانے کا وقت ہو جاتا مگر وہ اپنے زندہ کھلونوں یعنی اپنے کبوتروں کی اڑانوں کو دیکھتا رہتا اور جب اسے یہ کہہ کر زبردستی اسکول لے جایا جاتا کہ گھڑی میں دیکھو۔۔۔ کتنی دیر ہو گئی ہے تو وہ:

"جی میں بگڑتا کہ انسان نے یہ کیسی عجیب چیز ایجاد کی ہے جس

نے ساری دنیا کو پابند کر کے رکھ دیا۔ یہ گھڑی میرے اور میرے کبوتروں

کے درمیان دیوار بن گئی تھی۔ ایک روز میں نے اس گھڑی کی چابی کو

اس زور سے گھمایا کہ وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی پلے

اس بچے نے وقت کو روک لینا چاہا تھا۔ اس ضدی بچے کے والدین ایک شب بے

کو خلاف معمول اس سے پہلے بستر سے اٹھ گئے۔ اس کی والدہ نے اس کے ساتھ لوہے

کا بڑا سا چٹا رکھ دیا:

"..... میری آنکھ کھلی تو چٹا دیکھ کر میں آگ بگولا ہو گیا اور

ضد کرتے ہوئے والدہ اور والد سے دوبارہ سونے کو کہا۔ چنانچہ انہوں

نے رات کے کپڑے پہنے اور دروازے کا دیئے۔ پھر میں پہلے اٹھا اور

حسب معمول انہیں خود جگایا۔ میں بچپن سے ہی بڑا ضدی تھا۔ اور آج تک اس ضد نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے اپنی ضد کو کبھی نہیں دبایا۔ اور کبھی چاہتے دالے زندہ تھے تو میری ضد میں کبھی پوری کرتے تھے۔ اور اب یہ دنیا — خدا جانے ابھی کیا کیا دیکھنا ہے۔ اور میری مٹی کہاں کی ہے؟

یہ بچہ اسکول سے اس لئے بھاگ جاتا ہے کہ اسے باغوں کی دیواروں اور باروں سے پرے درخت اور ان کے پھلوں سے لدی شاخیں اپنی جانب بلاتی ہیں۔ وہاں کے گھونسلوں میں رہنے لینے دالے پرندوں کی چہکار پکارتی ہے۔ وہ یہ آوازیں سنتے ہی باقی سب صد آؤں سے بے نیاز ہو کر پیکا چلا جاتا ہے:

”سکول سے بھاگ کر میں، محمد علی، افتخار — بیروں، اناروں“

آموں اور امرودوں کے باغ اجاڑتے۔ ایک مرتبہ ہم نے امرودوں کے باغ میں آگ لگا دی۔ اور اس دن کے بعد باغ کا مالی کبھی نہ سویا۔ بہیڑے دالے پیر اور پنج پیروں کے مزار پر بیٹھ کر ہم سیر اور آم کھاتے تھے؟

سے بچپن میں بھی دہی کھلاڑی بنا ہے اپنا میت

جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری سیر (دیوان)

اس شرارت میں جہاں فطرت جو پہلے ہی ناصر کو بے حد پسند تھی، کئی حسین سبق دیتی تھی۔ اس ”چوری نما“ محنت سے حاصل کئے ہوئے پھل کھا کر جو فائنہ تسکین

اسے حاصل ہوتی وہ اس کی آنکھوں کی چمک اور گالوں کی سُرخی کو اور بڑھا دیتی۔ اور اس کی متحسّس طبیعت کسی اور شے کی کھوج میں لگ جاتی۔

ناصر کی غیر مطبوعہ دائریوں اور کچھ غیر مرتب ادراق کا مطالعہ کرتے ہوئے اور پھر ان کے عزیزوں اور احباب سے گفتگو کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بچپن بڑا شاندار گزرا تھا۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ انہیں بہت آرام اور آسائشیں میسر تھیں بلکہ اس لئے بھی کہ ان پر کوئی سخت قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی۔ اگر کبھی کوئی زنجیر ڈالی بھی گئی تو یہ اُسے توڑ کر آزاد ہو گئے۔ اسی لئے انہوں نے چھوٹی چھوٹی شوخیوں سے لے کر بڑی بڑی اور خطرناک شرارتوں تک سبھی کچھ کیا:

”نو شہرہ چھپاؤنی میں والد صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ وہاں ہم شہر سے دور ایک سرکاری ننگلے میں رہتے تھے۔ رات کو گیدڑ اور دوسرے جنگلی جانور ہمیں سونے نہ دیتے۔ ایک دن میں ریچھ کے غار میں اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا۔ اور دوست مجھے تنہا چھوڑ کر چلے آئے۔ اگر والد صاحب وقت پر نہ آتے تو اردو ادب ایک شاعر سے محروم ہو جاتا۔“

”ایک مرتبہ انہیں ناصر اور ان کے دوست افتخار کو ایک اور شرارت سوچی۔ امتحان کے دن نزدیک تھے۔ انہوں نے دو بم بنائے۔ ایک تو کمشنر کی کوٹھی کے پاس گرایا لیکن شکر ہوا وہ پھا نہیں۔ دوسرا بم اسکول کے پاس قبرستان میں پھینکا۔ وہ بہت دھماکے سے پھا۔ سارا علاقہ کانپ گیا۔ اسی وقت ڈپٹی کمشنر نے شہر میں انتہار لگوا دیتے کہ یہ معلوم کرو

کہ یہ ہم کس نے بنائے ہیں۔ جو کوئی اس کو پکڑ دے گا، یا اُس کا پتہ لائے
گا اُسے دو ہزار روپے انعام ملے گا۔ مگر کسی کو خبر نہ تھی کہ اسی محلے میں
چھپے رستم بیٹھے ہیں؟

ناصر کو دوست بنانے کا بے حد شوق تھا۔ دوستی میں طبقوں اور ذاتوں وغیرہ
کا کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ یہ خوبی اُن میں آخر تک رہی۔ بچپن میں بھی ہر قسم کے لڑکے
انہیں گھیرے رہتے اور ان کی حیثیت یہ تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ایک چاند ستاروں
کے جھرمٹ میں ہے۔ انہیں اپنی یہ دوستیاں ہمیشہ یاد رہیں:

جب بھی نئے سفر پر جاتا ہوں ناصر

پچھلے سفر کے ساتھ دھیان میں آتے ہیں

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

”دہاں میرا ایک دوست کوڑ بھی تھا۔ جو ہمیشہ میرے

کھلونے چُر لیتا اور میں والدہ سے کہتا کہ ٹوٹ گئے۔ وہ غریب اور

شریف لڑکا تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟“

”لکھنؤ میں بچپن میں میرے ایک دوست تھے۔

وہ دد بھائی تھے۔ انہیں گھر سے دو آنے روز کھانے کو ملا کرتے تھے۔ لکھنؤں امی

سے یہی بحث رہتی کہ ان دو آنوں کا صحیح مصروف کیا ہو۔ ایک کہتا پکوڑے کھالیں۔

دوسرا کہتا نہیں! پیٹ میں درد ہو جائے گا۔ پھر ابا ماریں گے۔ کبھی چڑیا گھر کی سیر

کی سوچتی۔ آخر طے یہی ہوتا کہ چلو دوئی کا گل تندا کھالیں۔ نہ پیٹ میں درد ہوگا

نہ ابا ماریں گے“ ایسے

ناصر کو سب بچوں کی طرح کہانیاں سننا بہت پسند تھا لیکن عام بچوں سے مختلف بات یہ تھی کہ ناصر کے لئے کہانی ایک ایسا آئینہ ہوتی جس میں کئی آئینے عکس در عکس پھیلے جلتے۔ وہ کہانیوں کو بھی پوری سنجیدگی سے سنتے اور سوالات کی بوچھاڑ کئے رہتے:

” ہمیشہ سے آج تک بچوں کو چڑے چڑیا کی کہانی سناتے آئے

ہیں کہ چڑیا نے کھچڑی پکائی اور ساری خود ہی کھالی مگر ناصر نے اس

کھچڑی پکانے والی بات کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ کہا کہ سب چھوٹے

ہیں۔ غلط کہتے ہیں۔ چڑیا نے بھلا آگ کیسے جلاتی؟ اس کے پر نہ جل گئے

ہوں گے اور ہنڈیا چولہا کہاں سے لائی ہوگی، لکڑی کیسے اٹھائی ہوگی؟“

پھر کہانیاں سنتے سنتے یہ سوا کہ دلی چال چلنے والے گھوڑوں پر سوار پرتقا شہزادوں

کے خوبصورت لباس، زیورات اور تھھیاروں کے رنگ اور چمک پہلے اس کے دل، پھر اس

کی سوج اور آخر اس کی آنکھوں میں سمٹ آتے لیوں وہ خود بھی گھوڑے کی سواری کو

بے حد پسند کرنے لگا اور گھوڑے کے سموں تلے اڑتے رنگین عناب میں ایک راجکمار کی

طرح ”کرن پر یوں“ اور ”خوشبوؤں کی شہزادیوں“ کو ڈھونڈنے نکل جاتا۔

”گھوڑے کی سواری کا مجھے بے حد شوق ہے ضلع انبالہ اور پٹالہ

کے تقریباً ۵۰ گاؤں اور پنجاب (گوجرانوالہ، لاہور، تپوکی، شیخوپورہ) کے

بشتیگاؤں میں نے گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے دیکھے۔“

۱۰ ایک مگالہ ”خوشبو کی ہجرت“ رسالہ سویرا ۱۰-۱۸-۲۰۱۳ ص ۲۱۳

۱۱ محترمہ صفیری بی بی۔ ایک تحریر

۱۲ ناصر کی ڈائری۔ نمبر ۱

ناصر کے بچپن میں کئی شوق تھے۔ سب سے بڑا شوق تو سکول سے فرار اور باغوں وغیرہ میں چوری اور کھیل کود کا تھا۔۔۔ ”میرے بچپن میں جو مشاغل رہے ہیں وہ یہی رہے ہیں، گھوڑ سواری، پہاڑوں کی سیر اور غالباً وہی ایک زمانہ تھا جہاں سے میرے ذہن نے فطرت سے محبت اور شاعری سے لگاؤ کے لئے نشوونما پائی“^۱

پھر ناصر تعزلیوں سے لے کر دیوالی کے چراغ روشن کرنے تک ہر شے میں گہری دلچسپی لیتے۔

”بچپن میں دیوالی کے موقع پر ہم رنگ رنگی موم بتیاں جمع کر کے لگھلا لیتے۔ پھر اس ہفت رنگ موم سے نئی بتیاں بناتے۔ دیکھنے والا نہیں بنا سکتا کہ اس بتی میں کتنی قسم کا موم ہے“

بچپن کی معصومیت کا ذکر ناصر بڑے پیار سے کرتے ہیں :

”نوشہرہ شہر میں ایک دن صبح صبح میں اپنے کوٹھے پر پراٹھا کھا رہا تھا کہ کچھ کوٹے میرے ساتھ آگئے اور ایک کو امیر اکھانا لے گیا۔ میں رونے لگا لیکن میری والدہ سنیں دیں اور مولوی اسماعیل میرے کھٹی کی مشہور نظم (کوٹے ہیں سب دیکھے بھلے جو پنج کالی پر بھی کالے) گا کر سنائی۔۔۔۔۔ ہائے وہ دن بھی قیامت تھی۔ خواب کی طرح گزر گئے“^۲

”بچپن میں اپنے دو قدم۔۔۔۔۔ تھی تھے ایک وہ لڑکے تھے جو اترتے ہوئے آتے اور بتایا کرتے تھے کہ ہمارے گھر گراموفون آیا ہے، ہمارے بڑے بھائی نے سائیکل خریدی

۱۔ ٹی۔ وی انٹرویو

۲۔ ایک مکتبہ ”خوشبو کی ہجرت“ ”سوریا“۔ ۱۷-۱۸-۲۰ ص ۲۲۰

۳۔ ناصر کی ڈائری۔ نمبر ۱

ہے، ہمارے تایا جان ڈپٹی ہو گئے ہیں دوسرے وہ لڑکے تھے جو آنکھوں میں حیرت لئے
دوڑے دوڑے آتے اور بتاتے کہ ہماری کنگنی پر چڑیایا نے گھونسلہ بنایا ہے یا یہ کہ سکول کے
پھوپھوڑے والے درخت پر جو فاختہ نے گھونسلہ بنایا تھا اب اس نے انڈے دیئے ہیں
یا یہ کہ فلاں نیم کی کھکھل میں طوطے کے بچے نکلے ہیں۔“ لہ

ناصر کو دوسری قسم کے بچے ہی زیادہ عزیز ہوں گے۔ یہ وہی ناصر ہے جسے گھنٹے کے
دقت پر بکنسے سخت چڑھتی ہے اس بچے کو کبوتر پالنے کا ایسا شوق ہوا کہ مرتے دم
تک نیکھ نیکھ پھیرو اس کی نظر کی دستوں تک اُڑا کر جاتے اور آتے رہے:
ہوا چلی تو نیکھ نیکھ پھیرو بستی چھوڑ گئے
سو فی رہ گئی کنگنی، خالی ہوئے منڈیر

گنج میں بیٹھے ہیں چپ چاپ طور برف لگھلے گی تو پر کھولیں گے
بگیم ناصر کاظمی نے بتایا کہ ”انہیں کبوتروں سے بے حد پیار تھا“ ان کی خالہ نے
لکھا ہے:

”جب ناصر چھوٹا سا تھا تب ہی سے اُسے کبوتروں کا شوق تھا۔
میرے بڑے بھائی نے بہت کبوتر رکھے ہوتے تھے۔ وہ ان کے لئے
مہالے بناتے تو یہ ان کے پاس جا بیٹھتا، اور کبوتروں سے کھیلتا۔ والد
کے ڈر سے گھر میں تو رکھ نہیں سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ جب چھ سات
سال کا ہو گیا تو وہ کبوتروں کے نام اور نسلیں پوچھتا اور آخر خود کبوتر
رکھنے شروع کر دیتے۔ بڑے گھر میں اس کی اماں اور دادا نے ڈر با
نوا دیا اور کبوتر بھی منگوادیتے۔ ایک بار پشاور چلے جانے کی وجہ

اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ میر ہی کے اشعار گنگنا یا کرتی تھیں، اور ناصر انہی کی طرح گانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ناصر کا اپنا ترنم بھی اچھا تھا۔ ان کے احباب اس خوبی کا ذکر آتے ہی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مصوری بھی شروع کی لیکن آخر شاعری میں ہی انہوں نے سب فنون لطیفہ کو سمودیا۔

ناصر کو سیر و تفریح اور سفر کرنا بھی بہت اچھا لگتا۔ انہیں اپنے سفر کی چھوٹی چھوٹی بات بھی یاد رہتی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کی طرف سفر کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

..... دریاخان صبح کے پانچ بجے آیا۔ یہ نہان تھا غیر آباد

اسٹیشن نہایت ہی دلچسپ اور حسین ہے۔ وہاں میر اسرخ کوٹ گاڑی کے نیچے گر گیا جو ہمارے نوکرتے نکالا۔

’سورہ ۱- ۱۹- ۲۰- ۲۱‘ میں ایک مکالمے کے دوران اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میر اسرخ کوٹ گاڑی کے نیچے گر گیا۔ اس دن میں نے

پہلی بار گاڑی کے پہیوں کو غور سے دیکھا۔ کالے کالے پہیوں میں میرا

کوٹ یوں لگ رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا بکرا“

..... ایک ماہ کے قیام کے بعد ڈیرہ اسماعیل خاں سے انبالے کی

دالسی مجھے یاد ہے۔ شام کے وقت ہم ٹانگہ لے کر عازم دریاخان ہوئے۔

دریائے سندھ طغیانی پر تھا۔ پانی کے جہاز فراٹے بھر رہے تھے جب

ہم نے کشتیوں کے دس پاٹ طے کرنے تو راستے میں اس زور کی

آندھی آئی کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا طوفان نہیں دیکھا۔ ہم نے

اپنا ٹانگہ رسوں سے بانڈھ دیا۔ اونٹوں کے قافلے اور اونٹنیوں کے زور

زرد، سنہرے بچے پریشان دحیران ریت کے ٹیلوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور وہی دریائے سندھ جو اٹک کے پاس مختصر سا ہے۔ یہاں ایک بحر بیکراں کی طرح ڈوبنے کو آمادہ تھا۔ بڑی مشکل سے ہم رات گئے دریاخان پہنچے۔

ناصر کے یہاں رات ایک عجیب، پراسرار مگر پرکشش اور مکمل کردار کی صورت میں آتی ہے۔ راتوں کے جاگنے کا وہ معمول جو آخر تک رہا اس کی عادت انہیں بچپن سے تھی۔ ان کی خالہ لکھتی ہیں کہ اتنی شرارتوں اور پڑھائی سے بظاہر لاپرواہیوں کے باوجود جب سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا تو ناصر رضا اول آتے اور اکثر دست قیل ہو جاتے۔ محلے میں سے اکثر دستوں کی مائیں آکر لڑا کرتیں کہ آپ کا بچہ ہمارے بچوں کا وقت ضائع کرتا ہے۔ دراصل اسے رات کو جاگنے کی عادت بچپن سے تھی۔ وہ رات بھر جاگ کر پڑھتا۔ جبکہ دوسرے بچوں کو وہ اتنا تھکا دیتا کہ وہ رات آتے ہی سو جاتے تھے۔ ناہر بہت ذہین تھا۔ ماسٹر اس سے بہت خوش تھے اور اکثر اس کی شرارتوں کو بھی نظر انداز کرتے تھے۔

ٹی۔ وی انٹرویو میں انتظار حسین نے پوچھا:

”--- ایک بات مجھے یوں یاد آتی ہے کہ جوں جوں رات گزرتی تھی تو تمہاری آواز میں ایک عجیب چمک اور گرمی پیدا ہوتی چلی جاتی لیکن جب صبح ہونے لگتی تھی اور تڑکا ہونے لگتا تھا اور چڑیاں بولتی تھیں تو تمہاری آواز میں بہت اُداسی آجاتی تھی اور جواد اس شعر تمہیں یاد ہوتے تھے تم اُس وقت سنا یا کرتے تھے۔ یہ رات اور صبح کا جو فرق تھا تمہارے یہاں یہ کیا تھا؟“

۱۔ ناصر کی ڈائری نمبر ۱

۲۔ محترمہ صفحہ بی بی۔ ایک تحریر

اس کے جواب میں ناصر نے کہا:

”یہ طلوع و غروب، اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ رات، اندھیری رات نہیں یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو، سمندروں میں موج ہوتا ہے رات کو، خوشیوں رات کو جنم لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ، فجر تک، فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی۔ ایک یہ بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جو ان راتوں کا ذکر کیا تو اب سبی راتیں جاگتی ہیں لیکن شہر سوتا ہے۔“ لے

یوں ناصر کے لئے آئندہ زندگی میں بچپن کی یہ صرف ”عادت“، ایک نئی دنیا میں پہنچ جانے کے مترادف ہو گئی۔ وہ دنیا جو پر اسرار ہونے کے باوجود حسین ہے، خاموش ہونے کے باوجود بولتی ہے، یہ تاریک نہیں کہ روشن چاند اور تارے اس کے ہمسفر ہیں۔ اس کی دھندلی فضاؤں میں انسان اپنے خوابوں کی تکمیل ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے سکون اور امن دینے والی دنیا۔ جہاں پابندیوں سے وقتی طور پر ایک حد تک ہی سہی نجات قبول جاتی ہے اور روحانی مزاج رکھنے والوں کے لئے اس جنت سے بڑھ کر اور کیا شے ہوگی۔

ناصر نے ابتدائی تعلیم وہیں انبالے میں حاصل کی۔

”میں نے پانچویں جماعت تک مشن گرلز سکول میں اور باقی والدہ مرحومہ

کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۲ برس کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ ۱۳ برس کی عمر

میں گلستان، بوستان، شاہنامہ فردوسی، قصہ چہار درویش، فسانہ آزاد،

الف لیلیٰ، صرف و نحو اور شاعری کی دیگر کتابیں ختم کر لیں۔ پانچویں اور

چھٹی جماعت میں نے نیشنل ہائی سکول پشاور سے پاس کی۔۔۔۔۔ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ، قلعہ اکبر میری پسندیدہ سیرگاہیں تھیں۔۔۔

پشاور سے ناصر ایلے چلے آئے اور ”دہاں ہم نے دسویں پاس کر کے۔ لاہور کی خبریں سنا کرتے تھے کہ یہ بڑا شہر ہے۔ پڑھنے کا شوق بھی تھا تو یہاں پڑھنے کے لئے آگیا اور وہ بچپن کا شاہانہ انداز زندگی لاہور آ کر بھی قائم رہا۔ بیگم ناصر کاظمی ناصر کے احباب اور احمد ندیم قاسمی سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ انہوں نے کالج میں بالکل الگ کمرہ لے رکھا تھا۔ یوں تو کالج میں ذاتی ملازم رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن ان کے پاس ایک ملازم بھی تھا جو ان کے لئے الگ سے کھانا پکاتا اور ان کی چیزیں سنبھالے رہتا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ سنوارے دکھتے۔ شاندار پوشاک سے لے کر مہذب ردیوں وضع داری اور شائستہ گفتگو تک۔ اپنے کالج کے زمانے میں بھی وہ ایک شہزادے کی طرح رہے۔ ساہتی انہیں ”Prince“ کہتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ناصر نے اپنا بہت خیال رکھا تھا۔ اپنے آپ کو سنوارے رہتے۔ اپنی صحت کی حفاظت کرتے۔ اپنے کپڑوں کی صفائی اور خوبصورتی پر دھیان دیتے۔ اپنے کھانے پینے پر توجہ دیتے لیکن بعد میں وہ اپنی طرف سے بے حد لاپرواہ ہو گئے تھے۔ بال بکھرے ہیں تو بکھرے رہتے۔ کپڑے شکن آلود رہتے لیکن وہ اپنے شاہانہ

لے ناصر کی ڈائری نمبر ۱

۱۷ ٹی۔ وی۔ انٹرویو

زمانوں اور عادتوں کو اس وقت بھی نہ بھولے۔ ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ ٹیکسی میں سفر کرنے کی کوشش کرتے۔ بلکہ جب انہیں مشاعروں کے سلسلے میں اسٹیشن یا ہوائی اڈے جانا ہوتا تو اپنے کسی کاروالے دوست سے کہہ دیتے کہ وہ کار بھیج دیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ناصر نے شاعری کب شروع کی۔ اور کس طرح شروع کی: ”میرے سارے ہی شغل ایسے تھے جن کا تعلق تخلیق سے اور فنون لطیفہ سے ہے، موسیقی، شاعری، شکار، شطرنج، پرندوں سے محبت، درختوں سے محبت، یہ سب جو بے معلوم ہوتے ہیں کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا؟“

ناصر کی بحیثیت شاعر اپنی پہچان کروانے میں ان کے ماحول کا بھی بہت حصہ ہے: ”شاعری مجھے اپنا نانا سید نیاز نبی مرحوم اور والدہ مرحومہ محترمہ کنیزہ محمدی بیگم سے ورثے میں ملی۔ میرے نانا اور والدہ شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے اور خود بھی موزوں طبع تھے۔۔۔۔۔ موسیقی، شعر و شاعری، سوز خوانی اور دیگر فنون سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے“

ناصر کاظمی ریویں بھی اپنے نہال دالوں کا زیادہ اثر ہے۔ اس لئے انہیں شعر آ کا کلام پڑھنے اور سمجھنے میں شروع سے ہی کوئی دقت نہ ہوتی ہوگی۔ ناصر کے احباب کا کہنا ہے کہ ناصر کا حافظہ بلا کا تھا:۔۔۔۔۔ مجھے ناصر کے مزاج کی جو خصوصیات نمایاں نظر آئیں، ان میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اچھی شاعری کا غیر مشروط عاشق تھا۔ وہ جہاں میر، مصحفی اور غالب کے کلام کا حافظ تھا

۱۔ ٹی۔ دی انڈیو۔۔۔۔۔

۲۔ ناصر کاظمی، ڈائری نمبر ۱

وہاں اپنے ہم عصروں بلکہ اپنے سے چھوٹوں کے بھی سینکڑوں اشعار اُسے ازیر تھے۔ اور اچھے شعر کی داد یوں بے ساختگی کے ساتھ اور ٹوٹ کر دیتا تھا کہ اُس کے حُسنِ ذوق کے علاوہ اس کی وسیعِ انقلبی سے بھی متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

یہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکا کہ ناصر نے شعر کہا کب شروع کیا۔ لیکن اتنا تو معلوم ہے کہ جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو غزلیں کہا کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں کہ شاعری کس طرح اور کیوں شروع کی، اپنے ٹی۔ وی انٹرویو میں بتاتے ہیں:

”یوں لگتا تھا مجھے کہ جو جو خوب صورت چیزیں میں فطرت میں دیکھتا ہوں وہ میرے بس میں نہیں آتیں، میری گرفت میں نہیں آتیں، اور نکل جاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ کچھ لمحے، کچھ وقت جو مر جاتا ہے، وہ زندہ دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری میں زندہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے شاعری شروع کی۔ طبیعت موزوں تھی۔

گھر کا ماحول بھی شعر و شاعری کا تھا۔ گھر میں ہمارے میر انیس پڑھا جاتا تھا، نانا میر موسیقی کا شوق رکھتے تھے اور میر نظیر حسین ناشاد، میر نیرنگ، یہ ہمارے — شعر میں بھی اچھی فضا تھی۔ کتا میں بھی گھر میں تھیں، بچپن میں ہم نے شیخ سعدی پڑھا، فردوسی پڑھا۔ یہ سب چیزیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ہمیں بچپن میں، قرآن حکیم، پورا آئینہ پورا لحن جو تھا وہ شعر کی طرف تھا۔ پھر ایک اور بات ہے جو مجھے سب سے اہم نظر آتی ہے۔ جب میں نے پہلا شعر کہا، مجھے یاد نہیں۔ مگر یوں لگتا ہے یہ شعر

میرا پہلا شعر تھا: قبول ہے جنہیں غم بھی تیری خوشی کے لیے

وہ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لیے

تو مجھے یوں لگا۔ اتنی خوشی ہوئی کہ شاید اس سے پہلے مجھے کبھی کسی چیز کی خوشی نہیں ہوئی۔ اگر مجھے شعر کے علاوہ اتنی خوشی کسی اور کام میں ہوتی تو میں شاعری نہ کرتا۔

تو پھر شاعری میں میں نے ایک جادو اور

دیکھا۔ پرانے اساتذہ کا جب کلام پڑھتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ زلزلے اور صدیاں میرے ساتھ ہم کلام ہیں بلکہ میں ان صدیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ یہ جادو کیا ہے؟ گو با شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ وہ وقت جو مر گیا جسے کوئی بھی زندہ نہیں کر سکتا، شاعر زندہ کر سکتا ہے اور اسی لیے شاید کہا تھا مولانا نے کہ :

شاعری جزو ایست از پینیری^۱ لے

”شاعری میں میرا صبح استاد میری والدہ تھیں اور ویسے آغاز

میں کچھ احباب سے مشورے بھی لیتا رہا ہوں۔ حفیظ ہوشیار پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عیشت، شاعری، فن۔۔۔ بچپن سے میرے خون میں^۲ ہے“

ناصر کے زمانہ تربیت کے عہد کو دیکھنے کے لئے ہمیں اس وقت کی سیاسی فضا اور

ادبی فضا کو دیکھنا ہوگا۔ سیاسی فضا کو جاننے کے لئے ہمیں کافی سمجھے جانا ہوگا۔ انگریزوں

کی آمد نے یہاں کی عظیم سلطنت کی فضیلتوں میں دراڑیں ڈالنا تو شروع کر ہی

دی تھیں، لیکن ۱۸۵۷ء میں یہ فضیلتیں ڈھ گئیں اور انگریز، ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

پھر پنجاب پر انگریزوں اور سکھوں کی اجارہ داری ہوئی تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے

اور مسلمان بحیثیت مسلم قوم احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔ مایوسیوں اور اُدا سیوں

نے انہیں گھیر لیا۔ اس احساس نے انہیں شل کر کے رکھ دیا۔ ان کی سوچیں بھی مفلوج

ہو کر رہ گئیں۔ آخر سر سید احمد خاں نے اس بے حس ہوتی ہوئی قوم کو یہ حساس

دیا کہ مایوسی کفر ہے۔ ہمیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بھی چلنا ہوگا اور بھلے

دنوں کی امید بھی رکھنا ہوگی۔ اور ایسا وقت ضرور آئے گا جب مسلمانوں کو ان کا

۱ لے ٹی۔ وی انٹرویو۔۔۔۔

۲ لے ناصر کی ڈائری۔ نمبر ۱

کھویا ہوا قارمل جائے گا۔ آخر سرسید کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنے حقوق کا احساس ہوا۔ سرسید کے انتقال کے چند برس بعد ہی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور یہی آغاز ہے اس بیداری کا جس کا نتیجہ پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔

سرسید یقیناً غالب سے متاثر تھے۔ اصلاحی تحریک اور تعلیمی تحریک کی وجہ سے وہ ادب میں افادیت پر بہت زیادہ زور دیتے تھے مولانا حالی نے ان کی خواہش کا احترام کیا۔ حالی صحیح معنوں میں شاعر تھے۔ ابتدا میں انہوں نے بہت خوبصورت غزلیں کہیں۔ لیکن جب اصلاحی شاعری کا خیال آیا تو اُس سے ایک نقصان بھی ہوا کہ حالی جیسا شاعر اعلیٰ شاعری سے محروم ہو گیا۔ لیکن ایک فرد کا نقصان اجتماعی طور پر فائدہ بن گیا۔۔۔ اور اس اصلاحی و مقصدی شاعری کی تحریک کی نہایت خوبصورت معراج اقبال تھے۔ آگے چل کر یہ تحریک ایک ایسی تحریک کا باعث بنی جس نے اُردو شاعری کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے یعنی ترقی پسند تحریک۔

علاوہ ازیں محمد حسین آزاد نے اسی زمانے میں باقاعدہ نظم نگاری کو رواج دینے کی سعی کی۔ پھر پاکستان بننے سے پہلے ہی شعر میں نئے نئے تجربے شروع ہو چکے تھے۔ تصدق حسین خالد، میراجی اور ن، م راشد آتے ہیں۔ اس تحریک کے مقلدین میں مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر وغیرہ ہیں۔ انہوں نے نظم معری کا آغاز کیا۔ اس طرز کے تجربے پُرانے شعرا نے بھی کئے تھے۔ مثلاً شرار اور اسماعیل میر بھٹی نے۔ لیکن اس طرز میں صحیح شاعری خالد اور نور اُجدن۔ م راشد نے کہی۔ راشد کا Contribution یہ ہے کہ نظم آزاد کا ایک انداز طے کر دیا۔ میراجی کے ہاں سادہ لفظوں سے پیدا شدہ ابہام اور ایک نیا طرز اظہار اہم ہیں۔ ان شعرا کی نظم نگاری کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شعرا کی پابند اور آزاد نظموں کا بھی زور ہوا۔

۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کا عہدِ رومانیت، بغاوت، انقلابی جدوجہد، سیاسی و معاشی وثقافتی و معاشرتی آزادیوں کی طلب کا عہد تھا۔ سبھی کے خیالات میں پھیل چکی ہوئی تھی وہ چاہے ترقی پسند تھے یا غیر ترقی پسند۔

ناصر کا مزاج بچپن ہی سے رومانوی خصوصیات کا حامل تھا۔ جوانی میں اس میں اور شدت پیدا ہوئی۔ ”برگ نے“ تک وہ رومانوی ہی رہے۔ اس کے بعد کے کلام سے وہ ایک حقیقت پسند رومانوی بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ رومانوی مزاج رکھنے والوں کی طرح ناصر میں بھی انفرادیت پسندی، شدتِ احساس و تخیل اور فطرت پسندی ہے اور جذبات کے اظہار کی بھی وہی شدت ہے۔ ۴۰ء سے قبل اردو شاعری میں تین نعرے واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ ایک تو نعرہٴ عشق جو معاشرے کے خلاف تھا۔ یہ فرد کے جذباتی ردیوں کی آزادی کا نعرہ تھا۔ دوسرا نعرہٴ انقلاب۔۔۔ جو سیاسی استبداد اور غلامی کے خلاف اور آزادی کے حق میں بلند کیا گیا۔ اور تیسرا نعرہٴ بغاوت کا تھا جو سبھی کا تھا ہر ایک باطنی ہو رہا تھا اور نئے راستوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔

ناصر کاظمی جب اسلامیہ کالج لاہور میں آئے تو یہاں کی فضا میں شعر و شاعری رچی بسی ہوئی تھی۔ ان کی اپنی طبیعت میں جدت پسندی اور انفرادیت تھی۔ لہذا انہوں نے عام ڈگر ترک کر دی اور روایت سے محض ان شعرا کی رہبری قبول کی جو ان کی طبیعت و مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔ مثلاً میر و فراق جلد ہی ان کی ہمسفری حفیظ ہوشیار پوری کے ساتھ ہو گئی جن سے انہوں نے شعر کی تربیت بھی حاصل کی اور نئی راہوں کی تلاش و جستجو کے لئے تحریک بھی۔ ویسے ناصر اپنے دوسرے بزرگ اور ہم عصر شاعروں سے غافل نہ تھے۔ یقیناً انہیں معلوم تھا کہ کن کن ترقی پسندوں کی غزل میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور غیر ترقی پسند کسی غزل کہہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ ناصر حساس ہونے کے ساتھ باشعور شاعر بھی تھے۔

یوں تو ایک شاعر کو کئی چیزوں سے محبت ہوتی ہے۔ اور یہ محبتیں اس کے جذبات و احساسات کی قوتوں کو برقرار رکھتی ہیں لیکن وہ محبت جو ہر شاعر اور خصوصاً اردو ماٹری شاعر کے نزدیک اصل زندگی ہے اور ان کی قوتوں کا سرچشمہ ہے، وہ ہے اپنی جنس کی محبت۔ ناصر کاظمی کے ایک قریبی دوست اور کالج کے ساتھی جیلانی کامران نے بتایا کہ:

”اولین محبت کی جو باتیں اس نے مجھے سنائیں ان میں

”حمیرا کا نام آیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ Humaira اپنی ناموں

میں سے ایک نام تھا جن میں سلمیٰ کا نام بھی آتا رہا لیکن جب وہ تیرا،

کا ذکر کرتا تو رونے لگتا۔ اور ایک رات تو وہ اسلامپور کالج ریاست

روڈ کے کارپور میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اور دیواروں سے

لیپٹ رہا تھا اور ”حمیرا، حمیرا“ کہہ رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔“

اب ایک انیس سالہ نوجوان باقاعدہ آنسوؤں سے رو دے اور بچپن پر سوچ کر دیواروں اور ستونوں سے لیپٹ جائے تو یہ کوئی فرضی اضافہ نہیں بلکہ سب کچھ ایک ایسی گہری اور حقیقت میں گزری ہوئی کہانی کا خاکہ بناتے ہیں جس نے ایک حساس شاعر کو ٹرپا ٹرپا پایا۔ یہ شاعر جو بہت ضدی ہے، جسے ہمیشہ سے وہ پینر میسٹر آتی رہی ہے جو اسے پسند آئی یا جس کی اس نے تمنا کی۔ اس لئے کہ اسے نہ صرف شہزادوں کی طرح دکھا گیا بلکہ یہ شہزادگی اس کے مزاج کی تہوں میں اتار دی گئی۔ یوں اس کی ہر خواہش پوری کر کے اسے یہ احساس دلایا گیا کہ وہ کبھی کسی شے کے حصول میں ناکام نہیں رہ سکتا۔۔۔ اور اس لاڈلے شہزادے کو ”حمیرا“ نہ مل سکی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ نہیں معلوم۔۔۔ لیکن محبت کی اس ناکامی نے لازمی طور پر وہ مجسمہ

کہ انہیں اپنی شاعری کی ابتدا ہی میں محبت کے سلسلے میں یہ دھچکا لگا۔ انہیں محبت نے دکھ اور اُداسی دے دی پھر کبھی وہ اپنے شعروں میں اپنے بے دغا محبوب سے بظاہر بے نیاز رہنے کی کوشش کا اظہار کرتے ہوئے بھی یہ کہہ اٹھے:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

اور انہیں یہ فکر بھی رہی کہ:

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے

بہت دنوں سے طبیعت مری اُداس نہیں

تجبتیں کامیاب رہیں یا ناکام وہ اکثر شاعر کو تخلیقی قوتوں سے ضرور مالا مال کر دیتی ہیں۔ اب خود ناصر میں محبت کی ناکامی کیسے کیسے حسین اور دل میں اتر جانے والے اشعار کی تخلیق کا باعث بنی۔ اور عجیب اور بڑی بات ہے کہ اس ناکامی نے انہیں زندگی سے ناامید بھی نہیں کیا۔

ابھی ناصر زندگی کی دھوپ سے بچ بچ کر سائے سائے ہی چل رہے تھے کہ آنے والی برصغیر اور قیام پاکستان کا دن آپہنچا۔ وہ دن جب آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو ہجرت کرنا پڑی۔ ناصر کا خاندان بھی ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔

”ابھی بی۔ اے کی ڈگری نہیں لی تھی کہ پاکستان بن گیا۔ ناصر

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب لاہور سے انبالہ گیا تو اپنے آبا کو کہنا شروع کر دیا کہ مکان فروخت کر دیجئے اور لاہور میں کوٹھی بنو لیجئے یا کوئی سہی بنائی خرید لیجئے اس لئے کہ بہت سے ہندو سکھ اپنے مکانات فروخت کر کے جا رہے ہیں۔ خدا جانے کیسا وقت آجائے اور ہمیں لاہور جانا پڑے۔ ناصر کے والد یہ سن کر بہت خفا ہوئے کہ ہم یہیں رہیں گے، اپنے باپ دادا کی قبریں

نہیں چھوڑ سکتے۔ ناصر کہتا۔ ”ابا! یہاں سے ایسے نکلیں گے کہ آپ اپنا حق بھی نہ اٹھا سکیں گے! آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ سوائے ایک دو بستر اور صندوقوں کے کچھ نہ لاسکے جس تکیر کے غلاف میں نقدی نوٹ سی کر رکھے تھے وہ راستے میں کہیں گم ہو گیا!“

”پاکستان جب قیام میں آیا تو کچھ اپنے دوستوں، عزیزوں پر مشتمل چھوٹا سا ہمارا ایک قافلہ — جب ہم نے داہگہ بارڈر کراس کیا تو میرے ابا نے پرچم منبر ہلال دیکھا اور کہا، ”بیٹا! مبارک ہو! تمہیں پاکستان مل گیا،“ تو میں نے ابا سے کہا تمہیں بھی مبارک ہو۔ تو میرے ابا کہنے لگے کہ تمہیں اس لیے مبارک دے رہا ہوں کہ تم وارث ہو اس زمین کے، تمہیں زیادہ رہنا ہے۔ میں تو اب تنہا ہوا، مورچ ہوں، دیوار ختم کر چل رہا ہوں اور اس کے بعد پاکستان میں جب ہم آئے تو ہم بھی بے سرد سامان تھے۔ تم ان لوگوں میں ہو جن سے میری پہلے ملاقات ہوئی۔ حسن عسکری، منٹو اور جتنے بھی دوست تھے — ندیم قاسمی صاحب، قیاس شافی، فیض صاحب، حفیظ ہوشیار پوری صاحب، پھر ملے۔۔۔ یہ واڈا ہاؤس، یہ کچھ نہیں تھا۔ بس کچھ درخت تھے۔ ہاتھ ملا کے ناچتے تھے اور ایسا لگتا تھا رات بھر درخت چاندنی میں ناچتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ہم پھرتے تھے۔ وہ راتیں ہری تھیں لیکن ایک بات اس میں تھی۔ اس بے سرد سامانی میں ایک جینے کی بڑی انگ کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں۔ تو اب پاکستان میں آکر میں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک دارالاماں مجھے مل گیا ہے —“

یہ جو ناصرا پنا سب کچھ وہاں چھوڑ آئے تو ایک اس کا ہی دکھ کیا کم تھا، مگر ناصرا تو ایک

شاعر بھی تھے، حساس، ہمدرد، بنظاہر سونے سونے لیکن اصل میں ہمیشہ جاگتے ہوئے شاعر۔
انہیں دوسروں کے دکھ بھی ٹڑپا گئے اور انہوں نے اپنی ذات کو پہلی بار اتنا پھیلا دیا کہ وہ
سارے اجتماع پر بادل کی طرح چھا گئے۔ اُن کا دکھ سب کا دکھ ہو گیا اور سب کا غم اُن کا
غم بن گیا۔ وہ کہہ اُٹھے :

شہر و شہر گھر جلائے گئے یوں بھی حشرِ طرب منائے گئے

اک طرف جھوم کر بھارا آئی اک طرف آشیاں جلائے گئے

کیا کہوں کس طرح سہ بازار عصمتوں کے دیئے بھجائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اسے ناصر خار و خس کی طرح بہائے گئے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
دیتے ہیں سُراغ فصلِ گل کا
جنگل میں ہوئی ہے شامِ ہم کو
رودادِ سفر نہ چھوڑنا
یادوں کے نکھے ہوئے سویرے
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
پھر اشک نہ ختم سکیں گے میرے

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ

دلی اب کے ایسی اڑھی گھر گھر پھیلا سوگ

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر

وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، میں

جو کچھ ناصر مجھے چھوڑ آئے اس میں ان کا انتہائی شاندار بچپن اور نوجوانی کا زمانہ ہے،

اُن کے کبوتر ہیں۔ ان کے باغ ہیں۔ دہاں کی خاص تہذیب، ثقافت اور معاشرت ہے،

اولین محبت کے دکھ کی دھیمی دھیمی ٹیسس ہیں۔ کارواں تو آگے بڑھا آیا لیکن پیچھے بہت

کچھ چھوڑ آیا۔ اور یہ سبش بہاد دولت یادوں میں ڈھل گئی جسین یادیں، جو افسردہ ہی کرتی ہیں اور اس پاس کے اجنبی اور غیر مطابق ماحول میں سکون بھی دیتی ہیں۔ یہ یادیں ہی انہیں غم کے زندگی بخش پہلو سے بھی آشنا کراتی ہیں۔ انہیں دکھی تو کر دیتی ہیں لیکن مایوس نہیں ہونے دیتیں۔ اس لئے کہ وہ ان صدیوں کے ملنے سے پہلے ہی کہہ آئے تھے کہ:

مایوس نہ ہو اُداس راہی پھر آئے گا دورِ صبح گا ہی
 ”ایک بات اس میں تھی، اس بے سروسامانی میں۔ ایک جینے کی بڑی اُمنگ تھی کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں“ لیکن امید سے بھرے ناصر جب یہاں پہنچے تو ایک تو یہاں وہ شہزادوں والے طور قائم نہ رکھ سکے، دوسرے ان پر کئی ذمہ داریاں بھی آگئیں۔ زیور اور رقم تو راستے ہی میں کھو آئے تھے۔ ادھر والد صاحب کی پنشن ہو گئی گھر کا سامان کچھ نہ تھا۔ آخر فین روڈ پر ایک کوٹھی میں قیام کیا۔ لیکن یہ کوٹھی بھی کسی افسر کو الاٹ ہو گئی۔۔۔۔۔ آخر پُرانی انارکلی میں ایک مکان میں آئے۔ مکان تو کافی بڑا اور کئی منزلہ تھا لیکن ایک منزل میں ماموں جان دوسری منزل میں ماموں کی چھوٹی بیٹی اور نیچے کی منزل میں ناصر کے والدین تھے۔ اس کا بھی باورچی خانہ اور صحن ماموں کی بڑی بیٹی کے پاس تھا۔ خیر جس طرح ہو سکا گزارہ کیا!

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ایک فتنی، لاپرواہ، بے نیاز اور ہمیشہ آرام و آسائش کے لمحات میں گم رہنے والا نوجوان اب ایک نامساعد ماحول میں ”گزارہ“ کر رہا ہے۔ اور یقیناً یہ ناصر کے لئے سب سے تلخ حقیقت تھی۔ ان سب دکھوں نے مل کر

۱۔ ٹی۔ ڈی انٹرویو۔۔۔۔۔

۲۔ مختصرہ صغریٰ بی بی۔۔۔۔۔ ایک تحریر

ناصر کی غزل کو وہ حُسن، وہ گہرائی، وہ معنی خیزی دی کہ محمد حسن عسکری جب سے نقاد رسالہ "ساقی" میں "جھلکیاں" کے عنوان کے تحت لکھی گئی تحریروں میں اس نوجوان شاعر کی غزل میں فسادات کے تجربے کو بہت خوبی سے سمونے کی تعریف کر اٹھے۔ اور ایک سال بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بیشتر شعر آناصر کی اندھا دھند تقلید میں مشغول ہیں۔۔۔۔۔۔ "ناصر کاظمی کی غزل کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ لوگوں نے اسے بھی ایک نسخہ بنا ڈالا ہے۔ جس طرح لوگ غزل کہتے ہوئے یہ فرض کر لیتے تھے کہ چھوٹی بحر میں کہا تو غزل یقیناً اچھی ہوگی اسی طرح اب یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر غزل میں وہ الفاظ اور ترکیبیں آگئیں جو ناصر کاظمی نے استعمال کی ہیں تو غزل کی کامیابی میں شبہ نہیں"۔۔۔۔۔۔ حالانکہ اصل میں۔۔۔۔۔۔ "ان کا تجربہ ان کے اندر جذب ہو کر رہ گیا ہے لیکن جو لوگ غزل میں ان کی پیروی کر رہے ہیں انہوں نے چند الفاظ کو تجربے کا قائم مقام بلکہ نعم البدل سمجھ لیا ہے۔۔۔۔۔۔ تجربے کے ساتھ جو درد سہنا پڑتا ہے اس کی مصیبت سے بھی بچ گئے اور غزل کو محض بن گئے۔۔۔۔۔۔" (اسی وجہ سے ہوا یوں کہ) ناصر کے اسالیب بیان کو اس کثرت سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ خود اس سے کترانے لگے ہیں۔

اس اقتباس سے ناصر کی غزل کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ناصر کی غزل میں وہ خصوصیات شامل ہونا شروع ہوئیں جن کے دم سے انہیں غزل کو حیاتِ نوبختی والا مسیحا کہا جانے لگا۔ وہ غزل کہنا تو شروع کر چکے تھے لیکن ان کا وہ خاص انفرادی رنگ جو بعد میں ان کی پہچان بنا، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ابھرا۔ دراصل "ناصر کاظمی کی شاعری کی نشوونما ۱۹۴۷ء کے آس پاس ہوئی ہے اور ان

زمانے میں ان کے ماحول کو جس آشوبِ قیامت سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کی انہوں نے حقیقت سے بڑی ہی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ زندگی اس زمانے میں جس طرح موت سے دوچار ہوئی ہے، رونقوں کا جس طرح خاتمہ ہوا ہے، بہاروں پر جس طرح خزاں آئی ہے، آشیاں جس طرح برباد ہوئے ہیں اس کو ناصر نے اس طرح پیش کیا ہے:

دلقب تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ لوگ تھے رنگاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں تم سے اے خزاںِ دلو صل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

یہاں آکر ناصر کو مالی حالات نے تو پریشان رکھا اور ان کے ادب کے میدان میں منی لفین بھی بہت سے تھے لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں چاہئے والے بھی بہت تھے۔ ان کا مزاج ہی ایسا بن گیا تھا کہ وہ ملازمت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ شادی ہونے تک انہوں نے ملازمتوں میں بالکل دلچسپی نہ لی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کی شادی ہوئی اور اس دن ان کی ”برگ نے“ بھی چھپ کر آگئی یوں بحیثیت شاعران کی مقبولیت اور شہرت کے لئے ایک راستہ متعین ہوا اور بحیثیت ایک فردِ انسان بھی انہیں اپنے فرائض کا احساس ہوا۔ ”جب یہ کتاب چھپی تو میرے لئے میری زندگی میں سب سے زیادہ فائدہ تھا“

بیگم ناصر کاظمی نے ان کی ملازمتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ میرے والد نے شادی کے لئے یہ شرط عائد کی کہ ناصر پہلے ملازمت کریں۔ ناصر اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بالآخر انہیں ریڈیو پاکستان میں ملازمت کرنا پڑی۔ مگر شادی ہرتے ہی اپنی ضد کو

۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ”جدید شاعری“ (ناصر کاظمی اور برگ نے) ص ۵۰۰

پورا کیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ پھر رسالہ ”ہمالیوں“ کی ادارت کی رپونے پانچ سال بعد رسالہ بند ہو گیا۔ پھر اپنا رسالہ ”خیال“ نکالا۔ وہ چلانا سکے۔ محکمہ اطلاعات کے ایک شعبے میں ملازم ہوتے۔ یہ شعبہ بھی ختم ہو گیا۔ ”ہم لوگ“ کے ایڈیٹر رہے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے سہارے گھر کا انتظام چلتا رہا۔ آخر پھر سے ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے اور تقریباً سات آٹھ سال اپنی وفات تک وہیں رہے۔

ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ شروع میں وہ گھر سے لاپرواہ تھے۔ انہیں پتہ ہی نہ ہوتا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ انہیں یہ تک معلوم نہ ہوتا کہ ان کے بچے کس جماعت میں ہیں۔ لیکن آخری برسوں میں وہ اپنے بچوں کے بے حد قریب آ گئے تھے۔ ناصر کے بڑے بیٹے باصر سلطان کاظمی کا کہنا ہے کہ آخری برسوں میں تو وہ ہم سے بالکل ہم عمر دوستوں کا سا برتاؤ کیا کرتے۔ ہماری کامیابیوں پر بے حد خوش ہوتے۔ آخری وقت میں ان کی یہ توجہ ہمیں اب اور زیادہ تڑپاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے وہ بچوں سے اور گھر سے جان بوجھ کر بے نیاز رہتے تھے وہ تو اپنے آپ کو بھی بھولے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ گھر بار کے خرچ کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہتے اور انہیں ایک دن کی بھی پریشانی نہ ہونے دیتے سے

تمام عمر یونہی ہم نے دکھ اٹھایا ہے
زیادہ خرچ کیا اور کم کیا ہے

یعنی بہر حال وہ کماتے ضرور رہے۔ اصل میں بات یہ تھی کہ انہوں نے شاعری اور زندگی کو ایک کر رکھا تھا:۔۔۔ دراصل اس کے یہاں گڑ بڑ یہی ہے کہ اس نے زندگی

اور شاعری کو گڈمڈ کر رکھا ہے۔ وہ شعر کہتا ہی نہیں شعر جیتا بھی تھا۔۔۔۔۔
... علیہ کے اعتبار سے وہ زیادہ عجیب نہ سہی لیکن جب وہ اکیلا چلتا ہوا

دکھائی دیتا ہے تو واقعی عجیب چیز ہوتا ہے۔ اکثر اس کے ہاتھ میں سگریٹ بھی ہوتی

ہے۔ ایک ہاتھ اچکن کی جیب میں، دوسرے ہاتھ میں سگریٹ نگلی ہوئی، منہ کا رخ ترچھے سے انداز میں آسمان کی طرف اور اس عالم میں وہ یوں چلتا ہے گویا قدموں کے نیچے والی مال روڈ وجود ہی نہیں رکھتی اور انارکلی کے بھرے بازار سے وہ اس بے نیازی سے گذرتا ہے گویا وہ ہنگامہ لوگوں کا ہجوم، وہ سچی بنی دکانیں اور کاریں، وہ پری چہرہ لوگ سر سے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ایسے عالم میں وہ اکثر دوستوں کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ سامنے سے گذر جائے گا، دیکھ لے گا اور یار میرے کو پتہ نہیں چلے گا کہ کون گذر گیا۔ ناصر کاظمی غریب اپنی شاعری پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اس کی شاعری اس کی زندگی میں دراز گھس آئی ہے۔“ ۱

”ناصر کی سب سے بڑی خوبی اُس کی اپنے فن کے ساتھ دابستی تھی۔ اور اس خوبی میں میں نے فرق آتے نہیں دیکھا۔ انسان اور شاعر کے درمیان اس تے ایک مساوات قائم کر رکھی تھی۔ اور جب وہ مجھے ملا اس نے یہی تاثر دینے کا اہتمام کیا ہے ناصر کے ایسے رویے کی جھلک جب بچپن میں اس کی بڑی بہن نے دیکھی تھی تو اسے ”پاگل“ کہہ دیا تھا، اور دوست احباب اسے ناصر کی ”عجوبگی“ کہنے لگے۔ اور اس عجوبگی کو پہچاننے کی سعی کرتے رہتے:

”اُن کی شخصیت میں سحر و اسرار کی ایک فضا تھی اور نگاہ میں طلسم بندی کی ایک ایسی کیفیت کہ سامع خود کو بندھا ہوا محسوس کرنے لگتے“ ۲

۱۔ انتظا حسین۔ ”نقوش“ مئی ۵۲ء دیکھو رکھتا ہے تو پہچان مجھے ص ۱۷۱

۲۔ جیلانی کامران۔۔۔ ایک خط

۳۔ خورشید رضوی۔ ”ادراق“ مارچ ۷۲ء ناصر کاظمی، ص ۳۰۱

انتظار حسین ایک واقعہ سناتے ہیں جو ان کی عجوبگی کے سلسلے میں ہے:

”یہی کوئی ڈھائی تین سال کی بات ہے، میں پرانی انارکلی

سے گذر رہا تھا۔ دیکھا۔۔۔ کہ ناصر کاظمی اپنی گلی کے سامنے اکیلا چپ چاپ ساکھڑا
 ہے۔ بیک بیک ہوئی۔ دو چار ادھر ادھر کی ہوتی، پھر میں نے کہا ”آئیے کاظمی صاحب
 کہیں چل کر چائے پیئیں“ جواب دیا۔ ”اس وقت تو نہ جاسکوں گا۔ آئیے پان کھالیں۔“
 سامنے پنواڑی کی دکان تھی۔ مجھے پان پیش کیا خود پان کھایا۔ پھر سگریٹ سلگاتے
 ہوئے کہنے لگا کہ ”انتظار صاحب چائے پینے چلتے مگر اس وقت ذرا قہہ یہ ہے کہ میری
 والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں سٹپٹا سا گیا کہ کاظمی کو پرسا کیسے دوں۔“

بیگم ناصر کاظمی کا کہنا ہے کہ ناصر صاحب کچھ عجیب سے تھے۔ بالکل مختلف قسم
 کے انسان تھے دوسرے لوگوں کی نسبت انبار مل سے۔ عام بات بھی سجا بنا کر کرتے
 تھے۔ سننے والا اُسے عجیب بات سمجھتا۔ ناصر کے ایک دوست شیخ صلاح الدین
 صاحب سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ان کی یہ عادت تھی کہ وہ عام باتوں میں بھی
 Fantasy کا عنصر شامل کر دیتے تھے اور ان کی باتوں میں ایک پراسراریت ہوتی
 تھی۔ اگر ان باتوں کو غور سے سنا جاتا تو وہ سمجھ میں آجاتیں لیکن سرسری طور پر دیکھنے
 سے سننے والی باتیں معلوم ہوتیں۔

”اپنی طرف سے تو اس نے غچہ دینے کو بھی ایک فن ہی بنانے کی کوشش کی

ہے جس انداز سے وہ یاروں کو جھل دیتا ہے اور جس میں خوبصورت بہانوں سے لے
 کر پتلیوں کی معنی خیز گردش تک بہت سی نازک حرکتیں شامل ہیں، اس کے متعلق
 اس کا تو یہی خیال ہے کہ اسے کوئی بھانپ نہیں سکتا۔ مگر اتنا ضرور صحیح ہے کہ اس

انداز کو بہت سے لوگ واقعی نہیں سمجھ سکتے ہیں

یہ واقعی ان کی عادت تھی کہ وہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ لیکن ہر بات کی تہہ میں ایک سیپائی کی بنیاد ضرور ہوتی جس پر یہ بلند و بالا عمارت تعمیر ہو جاتی۔ یہ مبالغے اور پراسراریت ان کی وہ خواہشیں ہیں جو زمانے نے پوری نہ ہونے دیں۔ ان کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی اسی عادت کی بنا پر انتظار حسین، ناصر پر اپنے ایک مضمون "آنکھ دکھتا ہے تو پہچان مجھے" میں اپنی سنسی کو روک نہ سکے۔ اس سلسلے میں ناصر کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ مثلاً "سجاد باقر رضوی صاحب نے کہا کہ انہیں صوفی غلام مصطفیٰ اعظمی نے بتایا کہ جب صوفی صاحب سنت نگر میں رہتے تھے تو وہاں سیلاب آگیا۔ کچھ عرصے بعد ناصر سے ملاقات ہوئی تو ناصر کہنے لگے "دیکھیے صوفی صاحب! میں نے سیلاب کا سنا تو مجھے بہت فکر ہوئی۔ میں اپنے ایک فوجی انسٹر کی جیب میں سوار ہو کر آپ کے گھر کی طرف گیا۔ بہت پانی تھا۔ پانی میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے مگر جب چوک میں پہنچے تو پانی گھوڑے کی گردن تک آگیا۔ اس لئے میں لوٹ آیا۔ بعد میں احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ میں نے جب ان سے پوچھا کہ جیب گھوڑا کیسے بن گئی تو ناصر نے جواب دیا کہ ایسے ہی احباب نے بات بنا رکھی ہے۔ لیکن یہ بات سچ نہ بھی ہو تو ناصر کی باتوں میں جیب سے گھوڑا بن جانے والا قصہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں لگتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ کئی بار احباب کو ان کی بتائی ہوئی معلومات پر شبہ ہوا اور انہوں نے تحقیق کی تو ان کی باتیں پچانوے فی صد درست نکلیں۔ اور مبالغے کا عنصر جو ایک شاعر کا تخیل تھا وہ صرف پانچ فی صد ثابت ہوا۔ ہم اگر ناصر کی شخصیت سے اس بے ضرر مبالغہ آمیز باتیں کرنے والی

خصوصیت کو الگ کر دیں تو ہم انہیں پہچان نہ پائیں گے۔ اپنے بارے میں اس قسم کی شاہانہ گفتگو ان کے احساس برتری کو ظاہر کر لے یا احساس کمتری کو، ہمیں تو کم از کم ان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ان پر اور پیار آتا ہے۔ ناصر نے زندگی اور شاعری کو ایک کر رکھا تھا اس لئے وہ جس بھی موضوع پر باتیں کر رہے ہوتے اپنے حسین تخیل سے ضرور مدد لیتے اور سامع کبھی اکتا ہٹ محسوس نہ کرتا۔ پھر ناصر کی گفتگو اتنی اور پختہ اور اتنی تخلیقی تھی کہ جب بھی ہم دونوں کسی مشاعرے کے سلسلے میں ہم سفر ہوئے، تو میرا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ آواز میں شعر سوش رہا ہے اور اس کی گفتگو ہمیشہ شعر و ادب کے بارے میں ہوتی تھی اور شعرا کے حقیقی مفہوم کو اجاگر کرنے کے لئے وہ زبان و بیان اور جذبہ خیالی کے بے شمار نکات کھوتا جاتا تھا۔^۱

ان کی عام گفتگو کے فقرے بھی خوبصورت مصرعوں کی طرح ہوتے۔ ناصر کاظمی سے باتوں باتوں میں کئی مرتبہ یہ سنا ہے کہ ”لفظ یوں آئیں جیسے کسی نے چراغ جلا کے رکھ دیتے ہیں“ اس فقرے پر میں نے کئی مرتبہ سر دھنا ہے اور حسد بھی کیا ہے کہ یہ فقرہ میں نے کیوں نہ کہا؟ یہاں مناسب ہوگا اگر ناصر کے نظریہ فن کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ سب سے پہلے ناصر کاظمی کے ”برگ نے“ میں دیا ہے ”اعتبارِ نغمہ“ پر نظر ڈالتے ہیں:

”۔۔۔۔۔ شاعر نے اس باولے کا بھیس بنا رکھا تھا

جو ہر گاؤں کے گردا گرد چکر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ پگلا گاؤں سے کتنا پیار کرتا ہے اور گاؤں والوں کے دکھ میں کس محبت سے اشک نشانی کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس پگلے کی پیغمبری ایک بڑا ناگوار اور دلہاز فریضہ ہے جس کو ادا کرنا کسی محفل پرست، دنیا دار اور مسلمات آشنا سخن ساز کے بس کی بات نہیں۔۔۔ آج کا شاعر نگری نگری گھومنے والے شاعر اور درباری سخن ساز دونوں کے مختلف مزاجوں کو ملا کے ایک نئی آواز پیدا کرنا

۱۔ احمد ندیم قاسمی ”فون“، اپریل مئی ۱۹۷۲ء ناصر کاظمی کی یاد میں، ص ۲۸

۲۔ اشعار حسین ”نقوش“ مئی ۱۹۵۲ء آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے

چاہتا ہے، جو اس کے اپنے گرد و پیش اور اس کے اپنے آسمان و زمین سے بھی غلاقہ رکھتی ہو۔۔۔
 ۔۔۔ آواز قومی ہو تو دور دور پہنچ جاتی ہے، نجیب ہو تو مطلق سے باہر ہی نہیں
 نکلنے پاتی، صرف پہنچنے کی بات نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن بھی سکتی ہے یا

نہیں۔۔۔۔

نارِ محفلیں برہم نہیں کرتا۔ نامہ آفریں پہ جو کچھ بھی گزری جو اس کی فریاد فن کے سانچے
 میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ پکار ہے۔“ راج

”۔۔۔۔۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا محض روایت کا

سہارا لے کر روایتی انداز میں روایتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور پرانے ماہرین کے فن
 کے چمکے تیلے مفرد صنفوں کو بغیر ہضم کیے اگل دیتا ہے۔ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے
 قاری بھی تیسرے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا روایت کو محض
 مورخوں کا زہد سمجھتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور عام انسان بھی اپنے جذبات کے
 ہجوم میں اپنے جذبات کی داد دیتا ہے۔ اسے شاعری یا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔

فن کار کا روئے سخن کسی ایسے نامزدی قاری کی طرف نہیں ہوتا کیونکہ وہ روایت کو جہاں
 اپنے ماضی کا بیتا جاگتا سرمایہ سمجھتا ہے وہ اسے مستقبل کی Water Supply کا منبع
 بھی سمجھتا ہے۔ شاعر کا کام تو نئے تجربات اور حقائق کو جانے پہچانے جذبات سے منک
 کرنا ہے۔ بہ تخلیق حال ہے فن کار کا یہی کام ہے کہ وہ ماضی کو حال بنا دے اور اس
 میں وہ تمام تجربات سمودے جو مستقبل کے سرچشمے بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فن کار
 ایک وسیع المشرب شخصیت کی طرح اپنے اندر دو چیزوں کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ ایک
 درخت دوسری پرندہ۔ پرندہ اڑ کر گم شدہ نادیدہ زمانوں کی خبر لاتا ہے اور ان کے اسماء
 پھراسے آبتانا ہے۔ درخت دن بدن بڑھتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی مدد سے ایک

پھر سر شاخِ شعاعِ خورشید نکہتِ گل کا بسیرا ہو گا
 آج پھر دستِ صحرائے جنوں پریشانی آبلہ پا چاہتی ہے
 اشارہ کرے جو نئی زندگی کا ہم اس خود کشتی کو روا جانتے ہیں
 شہرِ خلقِ خدا سے بیگانہ کارواں، میر کارواں سے دور
 فکرِ تعمیرِ آسمان بھی ہے خوفِ بے مہری خزاں بھی ہے
 خاک بھی اڑ رہی ہے رستوں میں آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

ناصر کی شادی، جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ یہ ناصر کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں صحیح
 معنوں میں ایک شریکِ حیات مل گئی۔ ان کی بیگم نے آتے ہی اپنے شاعر شوہر کی سبھی
 عادات سے سمجھوتہ کر لیا اور ان کی سچی رفیق اور غمگسار ثابت ہوئیں۔

”جس نے عنصر کو بھی ماں کا پیار دیا۔ اور ہر حالت میں ان کی
 مرضی کے مطابق رہی۔ کبھی کسی قسم کا شکوہ شکایت نہیں کی۔ کبھی نہیں
 پریشان نہیں کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ناصر کی طبیعت کو سمجھ گئی اور قوم کی
 امانت سمجھ کر برداں چڑھاتی رہی۔ خدا نے دو نچے دیئے۔ انہیں اللہ
 کی امانت سمجھ کر پالتی رہی۔ اور ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت میں کوئی کسر
 نہ چھوڑی ہے“

بیگم ناصر کاظمی نے ان کی پوشاک اور خوراک کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ
 بے حد خوش لباس تھے۔ باہر جاتے ہوئے سوٹ یا شیردانی پہنتے اور گھر میں کھدر کا
 کرتا یا جامہ پہنتے۔ بعد میں گرتے کے ساتھ شلواریں بھی سلوالی تھیں۔ کالج کے زمانے
 تک تو وہ اپنا بے حد خیال رکھتے تھے لیکن بعد میں اس طرف دھیان کم دینے لگے۔

پھر بھی وہ اپنی پُرانی جھلک ضرور دکھا دیتے۔ مثلاً سجاد باقر رضوی صاحب نے یہ دو واقعات بتائے کہ ایک بار ناصر ان کے پاس آئے تو بہت آندرد دکھائی دیے۔ وجہ پوچھی تو بولے۔ ”سفید جھکپتی ہوئی قمیص پہن کر آ رہا تھا۔ بس میں ایک شخص نے مجھے کندھا مارا اس کے پسینے سے قمیص کی سنیبلوں میں کمی آگئی۔ اسی لئے اُداس ہوں“ پھر ایک بار ناصر سجاد باقر صاحب کو کسی مشاعرے میں لے جانے کے لئے ان کے گھر گئے۔ سجاد صاحب جلدی جلدی تیار ہوئے۔ اور پھر زمین پر رکھے لمپ کاٹن پاؤں سے دبا کر بند کر دیا۔ اس پر ناصر کاظمی بے حد خفا ہوئے اور کہا کہ ”تمہاری اس حرکت سے دعوت سُکتی ہے۔ پھر کبھی اس طرح نہ کرنا“ کھانوں میں بھی خوش خوراک اور باذوق واقع ہوئے تھے۔ بہت اہتمام سے کھانا کھاتے۔ خوب مصاکے دار اور خوش ذائقہ چیزیں نوش کرتے۔ ریڈیو پاکستان میں جب ملازمت کی توجیح دفر جاتے ہی اناس کے رس کی فرمائش کرتے اور کہتے

"Pine Apple Jucie" کہتے ہوئے میری زبان خاص لذت محسوس کرتی ہے۔

بگم ناصر کاظمی نے بتایا کہ بارش ہوتے ہی وہ باہر نکل جانے کو بے چین ہو جاتے اور کبھی چھتری لے کر اور کبھی بغیر چھتری ہی کے چلے جاتے ہمیشہ یہی ہوا کہ جیسے ہی بونڈیں ٹپس ان کی روم جھم کشاں کشاں ناصر کو گھر سے باہر کھینچ لاتی۔

یہ خواب سبز ہے یادت وہی پلٹ آئی
چھتوں پہ گھاس ہوا میں نئی پلٹ آئی

میزہ جو بوسا تو برگ ریزوں نے
چھیر دی بانسری درختوں میں
پھرتی نسل کے عنوان چکے
ابر گر جا گلِ باراں چکے

پھر ساہن رُت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بھی تم یاد آئے

پھر کاگا بولا گھر کے سونے آگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے

پہلے تو میں چرخ کے رویا اور پھر ہنسنے لگا
با دل گر جا بسل چسکل تم یاد آئے
انہیں بسنت رُت بھی بہت عزیز تھی :

پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رُت آئی پیسے پھولوں کی تم یاد آئے

کونج کونج نوزن بسنت آگئی!
اب بچے کی انج بسنت آگئی
اُڑ رہے ہیں شہر میں چنگ رنگ رنگ
جھگا اٹھا لگن بسنت آگئی
بزرگھیتیوں پہ پھر نکھار آگیا
سے کے زرد پیرہن بسنت آگئی

پہلے سال کے مال دل سے مٹ گئے
سے کے پھر نئی چٹمن بسنت آگئی!

ناصر کے باں رات بھی ایک خاص کشش رکھتی تھی بچپن میں ضرورت کے
تحت جاگتے تھے لیکن اب رات انہیں خود جگانے لگی اور ناصر خود بھی نہ جان
پاتے کہ وہ جاگنے پر کیوں مجبور ہیں :

یہ سبھی چین سے کیوں سو رہی ہے
رات بھر ہم نہ سو سکے ناصر
پرودہ خامشی میں کیا کچھ تھا

” ناصر کا کہنا تھا کہ رات کا وقت تخلیق کا وقت ہے کہ کائنات رات ہی میں تخلیق ہوئی تھی۔ سو اس بستی کی راتوں کا کسی نہ کسی کو تو امین بننا تھا، کسی نہ کسی کو تخلیق درد کو زندہ رکھنے کا فریضہ انجام دینا تھا۔ جب رات کا جادو جاگتا اور شہر کی ہر گلی سوجاتی اور خالی رستے بولنے لگتے تو وہ رات کا بے نوا مسافر گلی گلی گھومتا پھرتا دیکھا جاتا۔۔۔۔

ایک عرصے تک آخر شب کے راگیروں نے، فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے پان سگریٹ والوں نے رات کے سناٹوں میں اس زنجی آدمی کو اداس اداس پھرتے اور شعر لگاتے دیکھا۔“

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے اب میں
رات آتی، چاند نکلتا اور ناصر گھر سے باہر سڑکوں پر کھلے آسمان تلے کچھ سوچتے ہوئے چلتے
چلے جاتے:

شام سے سوتح رہا ہوں ناصر چاند کس شہر میں اتر رہا ہوگا
چاند نکلا اُفتخ کے غاروں سے آگ سی لگ گئی درختوں میں
چلے تو ہیں جرس گُل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا
اور آخر لو پھوٹ پڑتی:

خاک بھی اڑ رہی ہے رستوں میں آمدِ صبح کا سماں بھی ہے
بیگم ناصر کاظمی نے ناصر کی ایک عجیب عادت بتائی کہ دن کے وقت ان سے جو بھی
سوال کیا جاتا اس کا جواب وہ اسی وقت نہ دیتے کہتی بار ایسا ہوا کہ بچوں نے کچھ پوچھا تو

خوبصورت، اور معصوم کبوتر ہیں جن کو ناصر بے حد چاہتے تھے گھر کی چوتھی منزل پر ان کبوتروں کے لئے ڈربے بنے ہوئے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے حسن سلطان کاظمی نے اپنے بابا سے کہا کہ آپ البم میں کوئی تصویر لگا کر اس کا افتتاح کر دیں اور ان کے آگے تصویروں کا ڈھیر لگا دیا۔ انہوں نے سب تصویروں میں سے دو کبوتروں کی ایک ایسی تصویر چن کر البم کے پہلے صفحے پر لگا دی جس میں صبح کی کرنوں میں ڈوبے دو کبوتر سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ وہ خود بھی بہت اچھی تصویریں اتار لیتے تھے۔

ناصر کاظمی سفر کے بھی بہت شوقین تھے۔ بچپن میں گھڑ سواری کے شوق نے اس دوسرے شوق کو بھی پورا کیا لیکن شہر لاہور میں آکر گھوڑے پر سیر کہاں ممکن تھی۔ ویسے ناصر اتنے حقیقت پسند تو تھے کہ یہ کہہ سکیں:

”کس قدر غلط ہے اگے اور ریل گاڑی کا مقابلہ اور کس قدر دلچسپ ہے گھوڑے کے مقابلے میں ریل گاڑی کی وقعت اور اہمیت۔ جب ریل نہیں تھی تو گوں اور گاڑیوں کا سفر خاصا بولہ تھا اس لیے ریل کی ضرورت تھی۔ اب کوئی لمبا سفر نہ ہوتا ہے تو ٹکٹ لیا، ریل گاڑی میں بیٹھے اور چل دیے۔ مقصد منزل پر پہنچنا ہے نہ کہ مشاہدہ یا تجربہ۔۔۔۔۔“

آجکل اتنی فرصت کہاں کہ ریل گاڑی میں فطرت کا مشاہدہ کرنے نکلیں۔ گھوڑے چھن گئے۔ اب تو ہم خود سفر کرتے ہیں۔ خوشبو کی طرح اڑنے پھرتے ہیں۔ گھوڑوں کو ریل گاڑی کے ساتھ نہیں دوڑاتے۔“ لے

لیکن سیر بہر حال نہ چھوڑی۔ وہ قدیم عمارتوں میں جانا بے حد پسند کرتے۔ شاہی مار اور

شاہی قلعے جا کر بے حد خوش ہوتے۔ مومن جو ڈر و گئے تو اسے بے حد محسوس اور بہت غور سے دیکھا اور بڑے شوق سے انہیں کھنڈروں کو پس منظر بنا کر تصویریں کھینچواتی۔ وہ ہر سال کوہ مری جانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اس میں ایک پہلو تو سیر کا تھا اور دوسرا پہلو یہ کہ مری پہ جانا بھی بڑی شان والی بات لگتی تھی اور ایسے موقع ناصر نے کبھی نہیں چھوڑے۔ بیگم ناصر نے بتایا کہ سفر بڑے اہتمام سے کرتے۔ انہوں نے بتایا کہ آخری بار ۱۹۷۰ء میں مری گئے، ۱۹۷۱ء میں تیار ہوئے لیکن بیگم ناصر نہ گئیں اس لئے ناصر بھی نہ جاسکے۔

طبیعت ہندی تو تھی۔ جو جی میں آجاتا وہی کرتے تھے۔ عمدہ چیزیں خریدتے۔ چھوٹی چھوٹی لیکن خوبصورت چیزیں۔ ناصر کے قریبی دوست شیخ صلاح الدین صاحب نے بتایا کہ ناصر سے جب کوئی کام کر دانا ہوتا تو اسے چیلنج کر دیا جاتا کہ تم یہ کام نہ کر سکو گے اور وہ ضد میں آ کر وہی کام ضرور کرتا۔ "امرکن سوساٹی" ایک کتاب جس میں ادب، فلسفہ، معاشیات اور سوشیالوجی وغیرہ پر مضامین ہیں، اس کے ترجمے کی بات چھپری تو ناصر نے اس کے ترجمے کی حامی اس لئے بھرنی کہ یہ ایک مشکل کتاب تھی۔ شیخ صاحب نے کہا کہ جب مجھے نامہ لکھنا پڑھا تو میں پہلے کتاب کی تعریف کرتا اور پھر کہتا "تم بھلا کیسے پڑھو گے یہ کتاب، رہنے دو، تم نہیں پڑھ سکتے اور پھر کتاب جان بوجھ کر ناصر کے پاس بھول آنا اور ناصر وہ کتاب نہ صرف پڑھتا بلکہ بحث پر آمادہ ہو جاتا۔ شیخ صاحب نے ان کے ایک عجیب طرز عمل کا ذکر بھی کیا کہ جیب میں پیسے بھی ہوتے تو کتاب نہ خریدتے کہ کون جیب میں ہاتھ ڈالے کہ رقم ادا کر کے کتاب حاصل کرے۔ انہوں نے بتایا کہ "میں نے ۱۳۶ مختلف کتابیں ناصر کو دیں۔ ان کی فہرست میرے پاس موجود ہے۔ میں نے ناصر کا امتحان بھی لیا۔ پھر کچھ کتابوں پر خود ناصر کے تحریر کردہ نوٹس بھی دیا ہیں۔"

ناصر کو ہر طرح کے آدمیوں سے دوستی کا شوق تھا اور وہ یہ دوستیاں نبھاتے بھی تھے۔ بڑے بڑے افسروں سے لے کر مزدوروں تک سے ان کی دوستی تھی اور سب انہیں بے حد

چاہتے تھے۔ یہی چاہے جانا تو انہیں زندہ رکھے ہوتے تھے۔ ورنہ یہ حساس شاعر ناموافق
فقا اور حالات میں اپنے آپ کو دقت سے اور بھی پہلے ختم کر لیتا۔ ناصر کی دوستیاں شروع
کس طرح ہوتی تھیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ناصر نے اپنے ٹی۔ وی انٹرویو میں یہ واقعہ
سنا یا کہ بارش بہت پور سی تھی اور تانگے والا بارش میں کرشن نگر نہ جاتا تھا جہاں معمولی
بارش سے بھی سڑکیں زبیر آب آجاتی ہیں۔ آخر اسے جب معلوم ہوا کہ ناصر شاعر ہیں تو بولا
کوئی شعر سناؤ۔ اور ناصر کے یہ شعر سننے پر نہ صرف تانگے والا راہنی ہو گیا بلکہ کہا: ”اے
لوندے تیرا یہ شعر ہے۔ آبیٹھ تانگے میں ساری عمر مفت لے جاؤں گا“ اور واقعی تا دم آخر
وہ انہیں مفت لے جاتا رہا یہ شعر یہ تھا:

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہونے بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا
ناصر کی پسندیدہ شخصیتوں میں سے کچھ یہ ہیں۔ میر، فراق، میرا بانی، آزاد، ناصر کے
یہاں وہ تعصب بالکل نہیں جس کے تحت عورت ذات کو مردوں سے کم عقل کہا جاتا ہے
بلکہ انہیں میرا بانی کے بھجن میں وہ سن نظر آیا جو اور کہیں نہ ملا۔ انہیں انگریز شاعر
ایڈتھ سیٹ دل بھی عزیز ہے۔ میر سے ان کی دوستی کو سمجھی جانتے ہیں۔ محمد حسین آزاد سے
ان کی دلچسپی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی میز پر ہر دقت ”آب حیات“ رکھی
رہتی تھی۔

ناصر اپنے دکھ اپنے اند۔ اتارے چلے گئے غموں نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا۔
وہ بیمار رہنے لگے۔ شراب وہ پیتے تو تھے لیکن اتنی زیادہ نہیں جو ان کی صحت کو اس
حد تک خراب کر دیتی۔ دراصل بہت زیادہ حساس شاعر اور وہ بھی ردمانوی مزاج
رکھنے والا اس دنیا میں بہت کم عرصہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ لوگ سائے میں اُگنے والے
پودے اور دھند میں کھلنے والے پھول ہوتے ہیں جو سورج کی کرنوں کا مقابلہ نہیں کر
سکتے۔ پھر یا تو تھک جاتے ہیں یا مرجھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ناصر بھی مقابلے

ناصر نے جنگِ دہمیر میں کئی ترانے لکھے۔ اور جب سقوطِ ڈھاکہ ہوا تو ناصر بے اختیار رو دیتے۔ ان کے بیٹے ناصر نے بتایا کہ وہ اس واقعہ پر اتنا زیادہ روئے تھے کہ ہم حیران رہ گئے۔ واقعی بہادر لوگوں کے آنسو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن کیا ناصر نے کبھی تنہائیوں میں آنسو نہ بہاتے ہوں گے۔ ضرور ان کی ٹیکس نم رہی ہوں گی لیکن انہوں نے اپنے دکھ کسی پر ظاہر نہیں کئے، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا یا۔ بھلا بہادر شہزادوں کو یہ زیب دیتا ہے؟ بس اگر ناصر پھر کسی کے سامنے روئے تو اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے۔

میں ان چند لمحوں کو اپنی عزیز یادوں کے سرمائے میں داخل کر چکا ہوں جو حکیم مارچ کو میں نے اس کے ساتھ بسر کئے۔ میں البرٹ وکٹر ہسپتال پہنچا تو ناصر کے پاس سجاد باقر رضوی تشریف فرما تھے۔ میں اس کے پاس صرف ایک گھنٹہ بیٹھا۔ اس دوران ناصر مسلسل بولتا رہا۔ سانس کی تکلیف کی شکایت کی۔ گھر جانے کی اجازت کی تمنا ظاہر کی۔ پھر اُس نے خلوص و محبت کے اُن بے بہا جذبات کا اظہار کیا جن میں زندگی بھر کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔ دوسرے شاعروں کے اشعار کی طرح اسے میرے بھی سینکڑوں شعر یاد تھے۔ اور اس روز بھی اپنی موت سے صرف بارہ تیرہ گھنٹے پہلے وہ میرا ایک ایسا شعر پڑھ رہا تھا جو شاید ابھی کہیں چھپا بھی نہیں مگر میں نے اسے کسی طویل سفر کے دوران سنایا ہوگا۔ میں اس احساسِ تفاخر کے ساتھ اپنا یہ شعر پیش کرتا ہوں کہ ناصر اسے اپنی زندگی کے آخری روز پڑھ رہا تھا اور دور رہا تھا۔ شعر یہ تھا:

مرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی

کنویں اُداس مرے، کھیت بے ثمر میرے

یا تو اس شعر میں ناصر کو اپنے پورے سوانح دکھائی

دے رہے تھے یا وہ اس طرح بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار

کر رہا تھا۔ مگر وہ شعر پڑھتے ہوئے روکیوں رہا تھا؟ پھر جب میں نے اس سے اجازت چاہی اور اس کے دونوں ٹھنڈے ہاتھوں سے اپنے دونوں گرم ہاتھ ملائے تو اس نے میسر ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور یہ ہاتھ ناصر کے آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اُس وقت میں اگر وہاں ایک لمحہ بھی رکتا تو بچوں کی طرح رو دیتا!

اور بالآخر ناصر اپنی زندگی کی آخری رات بھی جب جاگ چکا تو صبح ہوتے ہی اسے پھر نیند آگئی لیکن یہ ایسی نیند تھی جس سے جاگنا پھر ناصر کے اپنے اختیار میں بھی نہ تھا۔ اور ناصر یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا: ”میرا سلام کہتے۔ لاہور شہر کے نواح سے، دوستوں سے، قہوہ خانوں سے، درختوں سے، چڑھیوں سے، پرندوں سے!“

اور جب ناصر چلا گیا تو ناصر پر لکھے گئے مضامین سے اخبارات و رسائل بھر گئے۔ تب سب کو معلوم ہوا کہ کتنا بڑا شاعر اس دنیا سے چلا گیا۔ سب کو اپنی اپنی زیادتیاں یاد آئیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ شہزادہ تو پہلے ہی اپنی غزلوں میں اپنے جلنے کی خبر دے چکا تھا۔ اشارہ کر چکا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے روکنا چاہتے ہو تو روک لو۔ لیکن اس وقت تو سب نے صرف شعر کی داد دی۔ یہ نہ دیکھا کہ شعر میں ایک شاعر نہیں بول رہا ایک جیتا جاگتا انسان

اپنے مرجانے کو محسوس کر رہا ہے :
 آیا گیا نہ میں کہہیں، صبح سے شام ہو گئی
 جلنے لگے ہیں ہاتھ کیوں ٹوٹ رہا ہے کیوں بدن

زنگ پیلا ہے تیرا کیوں ہنر تجھے کیا رنج کھائے جاتا ہے
 اور آخر کار :

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
 سدا ہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ
 مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
 وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا
 رقم کریں گے تیرا نام امتسابوں میں
 کہ انتخاب سخن ہے یہ انتخابوں میں

پھر ناصر کا کلام ”دیوان“ کے عنوان سے چھپا جس کے سرورق پر ایک سفید اور
 معصوم کبوتر اپنے چاہنے والے کو ڈھونڈ رہا ہے ”دیوان“ کو آدم جی ادبی انعام بھی
 ملا۔ مگر اس وقت ناصر جا چکے تھے۔ البتہ ان کی غزل زندہ تھی اور وہ سدا زندہ ہے
 گی۔ مسیحاؤں کے معجزوں کو زوال نہیں آیا کرتا۔ ناصر بھی یہ جانتے تھے۔ اسی لئے
 تو انہوں نے کہا تھا :

ہر درد کی غزل میں میرا نشان ملے گا

(دوسرا باب)

اردو غزل: قیام پاکستان تک

اردو غزل کی ابتدا صحیح معنوں میں عملاً وکی سے ہوئی اور پھر غالب تک اردو غزل مسلسل ارتقا پذیر رہی۔ وکی سے غالب تک کے عرصے میں برصغیر پاک و ہند کی سیاسی حالت بہت پر اگندہ رہی۔ بادشاہ جو عوام کے جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں کچھ اپنی نااہلی اور کچھ اپنی مجبور یوں کی وجہ سے اپنے فرائض سے دست کش سے ہو گئے اور یوں باہر کی دنیا سے فرار حاصل کر کے اپنی ذات کے اسیر ہو گئے۔ ہر قسم کی برائیوں کے پھولنے پھلنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ چنانچہ ہر اسکائی خرابی نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی انتشار کی نذر ہو گئی۔ یہ صورت حال اندرون ملک بنا دتیں برپا کرتی ہے اور بیرون ملک سے حملہ آوروں کو شہ دیتی ہے، سو یہی ہوا اور شاہ عروج امن اور حسن اور توازن کا رسیا ہوتا ہے، اپنے گرد و پیش کے یہ حالات دیکھ کر دکھی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میر درد بھی اُداس رہے، میرزا اسودا بھی پریشان رہے، اور میر تقی میر کی غزل کو تو دل اور دلی کا مرثیہ کہنا چاہیے۔ میر جو اپنے سماجی حالات کو ان کی تہ تک اتر کر محسوس کرتے ہیں، کیسے غم زدہ نہ ہوتے۔ اپنے زمانے میں معیاروں کی شکست کو انہوں نے عشق کی ناکامی سے مربوط کر دیا۔ میر کے نظریہ حیات کی نمائندگی ان کا یہ شعر پوری طرح کرتا ہے۔ بظاہر اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا رونا ہے مگر غور

سے دیکھتے تو حُسن کا بھی اثبات ہے اور اس تغیر کا بھی جس کا دوسرا نام ارتقا ہے کہ جب گل مرچھاتا ہے تو گل اس کی جگہ لینے کو موجود ہوتی ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کاشبات گل نے یہ سن کر تبسم لیا
میر کی غزل نے اُردو غزل کو غلط راہ پر جانے سے روک لیا اور اس کے تہتار
کو سمیٹا۔ میر ہی کے ہاں اُردو غزل کا وہ مزاج متعین ہوا جو آج اس کا ناگزیر
حصہ ہے۔ میر کی آنکھیں بیشتر پر ہم ہی رہیں لیکن وہ مسکرانے کی خواہش سے دست کش
نہیں ہوئے تھے۔ ع ”وصل اس کا خدا نصیب کرے“ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور میر کو
مسترت کے ترانے گانے کا موقع نہ مل سکا۔ مزاج مزاج کی بات ہے۔ غالب بھی
تقریباً ایسے ہی حالات میں رہے۔ ان پر بھی مادی اور جذباتی المیے گزرتے رہے مگر
انہیں مستقبل پر غیر معمولی اعتماد تھا۔ انہوں نے جل چکے جسم کے بھو بھیل میں کچھ چنگاریاں دیکھ
لی تھیں۔ تب ہی تو راکھ کو کریدنے کا شغل جاری رکھا۔ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ ع
”دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی“ تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ انہوں نے امید و
رجا کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔ تب ہی تو انہوں نے اتنے اعتماد سے اس تمنا کا اظہار
کیا تھا کہ

سے کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پاداد می پرخسار میں آوے

انہیں یقین تھا کہ یہ ”آبلہ پا“ آئے گا۔ بس عزمِ راسخ کی ضرورت ہے اس لیے کہ

ع توفیق با اندازہ ہمت ہے ازل سے۔

غالب تغیر اور جدت سے خائف نہیں تھے بلکہ دلدادہ تھے۔ انہیں جب دُور دُور

تک کھنڈروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تو انہوں نے ان کھنڈروں میں ہی نئے چراغ جلا

دیئے اور ان کی اونچی رقصاں لووں کی روشنی میں جہاں پرانے پن کی خوبیاں اور

خامیاں نمایاں ہوئیں وہیں نئے سن کی اچھائیاں بھی اجاگر ہونے لگیں۔ غالب نے غزل کو نئے موضوعات کی مدد سے بہت وسعت دی اور اپنی جدت پسند طبیعت کی وجہ سے اظہار و بیان میں بھی تازگی پیدا کی۔ فتح محمد ملک کہتے ہیں: ”غالب ہماری فکری اور تہذیبی تاریخ کے اس نازک مرحلے پر نمودار ہوتے جب ہمارے ذہن میں قرونِ وسطیٰ کے دھند لکوں سے عہد جدید کی روشنیوں کی طرف قدم بڑھانے کی کش مکش برپا تھی۔ تاریخی اور تہذیبی ماحول کی نسبت سے غالب کے فنی اور فکری نشوونما کا خیال کرتا ہوں تو مجھے غالب کے کارنامہ فن اور ان کے ہم عصر علمائے دین کی اصلاحی اور انقلابی جدوجہد میں ایک خاص ربط نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے غالب کی شاعری اس عہد کے ہندی مسلمانوں کے اجتماعی دینی اور سیاسی فکر و عمل کا فنی اور جالیاتی تکرار ہے۔“

غالب نے اردو غزل میں فکر و شعور کی گہرائی شامل کی اور یوں غزل کے وقار میں استحکام پیدا کیا۔ یہ فکر انگیز اشعار غالب کی قومی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پاپا
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے، صفحہٴ دشت
نقشِ پاپا میں ہے تپِ گرمیِ رفتارِ ہنوز

غالب کے یہاں انسانی نفسیاتی گہرائیوں کے عکاس شعری ہیں:
بھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
انسوں انتظار، تمنا کہیں جسے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
 زنگ کھلتا جاتے ہے جتنا کہ اڑتا جاتے ہے

”غالب انسان کے بنیادی اور بعض صورتوں میں دوامی جذبات و احساسات کا شاعر ہے اور اس نے جذبہ و احساس کو دانش و ادراک پر یادانش و ادراک کو جذبہ و احساس پر قربا نہیں ہونے دیا یوں اس کے ہاں رومانیت اور حقیقت کا بے حد متوازن اور دلاویز امتزاج ہے۔ غالب آج کے دور آئندہ آنے والے شعر کا سب سے پہلا رہنما ہے اور جس انداز کی غزل کو جدید غزل کہا جاتا ہے اس کی مضبوط ترین بنیادیں غالب نے ہی اٹھائی تھیں لیکن۔۔۔“ غالب کی جدید غزل نے جو روایت قائم کی تھی اس کا تسلسل ۱۸۵ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس بڑی طرح ٹوٹا کہ حالی تک مطلع قریب قریب صاف نظر آتا ہے، بلکہ ”ایسا محسوس ہوتا کہ داغ، امیر اور ان کے شاگردوں اور متاثرین کی غزل دراصل غالب کی غزل کا رد عمل تھی۔ حالی نے خود کہا کہ ”نی زمانہ غزل کی حالت نہایت اتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے“ حالی اردو غزل کے ”حال“ سے مایوس نظر آتے۔ یوں تو ڈاکٹر ابواللیث مدنی کی حیرت درست ہے کہ جس نے میر اور غالب کی غزلیں پڑھی اور دیکھی ہوں اس کا غزل کے امکانات سے مایوس ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ حالی کو غالب جیسی عظمت شخصیت کی جگہ لینے والا کوئی شاعر

۱۔ احمد ندیم قاسمی ”حرفِ ادب“ فنون، غزل نمبر ۲۹ء۔ ص ۱۶

۲۔ احمد ندیم قاسمی ”حرفِ ادب“ فنون، غزل نمبر ۲۹ء۔ ص ۱۶

۳۔ الطاف حسین حالی۔ ”مقدمہ شعور شاعری“

۴۔ ڈاکٹر ابواللیث مدنی۔ ”غزل اور متغزلین“ ص ۶۔

آگے بڑھتا محسوس نہ ہوا بلکہ اس وقت کے شاعر تو غالب کے ردِ عمل میں غزل کے قدیم ترین کلاسیکی رنگ کو بغیر کسی واضح جدت کے اضانے کے اپنائے ہوئے تھے پھر اس وقت ہندوستان غلام بنا سر جھکاتے کھڑا تھا۔ اور یہ یہاں کے لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا دکھ تھا جسے یقیناً حالی نے محسوس کیا، جو فطرتاً سوز و گداز کے مالک شاعر تھے۔ حالی کو اس وقت دو کام کرنا تھے۔ ایک تو بھرتی ہوئی تہذیبی روایت کو جوڑنا اور دوسرے نئے قدموں کی چاپ سنا اور سنانا۔ لیکن چونکہ وہ کوئی ایسی مضبوط بنیاد نہ پاسے تھے جس پر وہ مشکلات کے حل تعمیر کر سکتے اس لئے انہیں جب بھی اپنی حیران، ڈھونڈتی سوز کو کوئی چھوٹا سا سہارا بھی ملتا دکھائی دیا وہ وہیں رک گئے اور آخر سر سید کے زیر سایہ چاہئے۔ جس بات کی سرسید نے خواہش کی اُسے پورا کرنے کی اپنی سعی کوشش کرتے رہے، چاہے اس کے لئے انہیں اپنے مزاج اور فطرت کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑی۔ یوں حالی نے اصلاحِ غزل کی تحریک شروع کی۔ حالی چاہتے تھے کہ ”شاعری جھوٹے اور رسمی جذبات سے مہٹ کر واقعیت اور حقیقت کی طرف لوٹ آئے“

حالی کے نزدیک غزل کو صرف حُسنِ عیش کے معاملات کی حدود ہی میں نہیں رہنا چاہئے بلکہ غزل کو کچھ اور خیالات اور کچھ اور مضامین کے ذریعے وسعت دینا چاہئے۔ حالی کی اصلاحِ غزل کی ”تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ رہی، ہے کہ اس طرح اس نے غزل کو موضوع اور طرزِ ادا دونوں اعتبار سے وسعت دی، حالی نے جو کچھ کہا اس پر اپنی غزلوں میں عمل کرنے کی بھی کوشش کی اور احساس دلایا کہ:

۱۔ فیض احمد فیض... ”میزان“ (حالی اور نظیر) ص۔ ۱۰۰

۲۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ”غزل اور مطالعہ غزل“ ص۔ ۳۸۱

یارانِ تیز کام نے عمل کو حبا لیا
 ہسم محوِ نالہ جرسِ کارواں رہے
 لیکن وہ خود انسانی نظرت کے ایک بہت مہذب جذبے یعنی محبت سے
 آنکھ چپا کر گزر نہ سکے، اس لئے کہ ہزار مصلحتوں کے باوجود:
 ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
 دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
 اور اپنے جذبات پر زبردستی کا پہرا لگا کر حالی نے اپنی رچی ہوئی، سادہ اور
 سلیس غزل کو دماغانہ انداز کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں اپنی غزل
 کو نقصان ہی پہنچایا:

بڑھاؤ نہ آپس میں ہلت زیادہ

مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

حالی کا مقصد نیک تھا لیکن وہ اس کے اظہار کا مناسب طریقہ نہ اپنا سکے اور ان
 کی غزل اعلیٰ شاعری کا نمونہ نہ بن سکی۔ البتہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ حالی
 نے نہ صرف اپنے زمانے کے حالات کے تقاضے کے مطابق بلکہ شاید لاشعوری طور
 پر غالب کے مخصوص نئے پن کو آگے بڑھانے کی کوشش میں اردو غزل کی روایت پر
 اپنی غزل سے جدیدیت کی روشنی پھینکی اور غالب ہی کی طرح حالی نے بھی یہ ضرورت ثابت
 کیا کہ ”نئے تصورات اظہار کے لئے نئے الفاظ اپنے ساتھ خود لاتے ہیں“

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے

اے آسمان کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارہ

آدیں اُس کو ہمیں جا کر منا اُس کی بے پروائیوں پر جہیں کیا

تھا کچھ نہ کچھ کہ بچا بس سی اک دل میں چُپھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر دسناں نہ تھا

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کیا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم

سے دھوم تھتی اپنی پار سائی کی کی بھی اور کسی سے آشنائی کی
اُردو غزل حالی سے ہوتی ہوئی اقبال تک پہنچی تو وہ داغ، امیر، اکبر اور
چکبست سے آشنا ہو کر آئی تھی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جو دہلوی اور لکھنوی
رنگ یکجا ہوا اس کی نمائندگی داغ کے حصے میں آئی۔ داغ نے اپنا ایک خاص
انداز اور لہجہ بنایا۔ انہوں نے حسن و عشق کے معاملات میں شوخی اور سنگتگی کے ساتھ
ساتھ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور ستھرے اندازِ نظر کو اپنایا۔

”داغ نے ایک زوال پذیر معاشرے میں پرورش پائی۔ پھر انہیں جو فارغ البالی
تمام عمر تیر رہی اس کی وجہ سے بھی کوئی اہم مقصد ان کے سامنے نہ رہا۔ اس لئے ان
کے کلام میں گہرائی نہ پیدا ہو سکی۔“ داغ بڑے شاعر نہیں ہیں مگر ایک معنی میں بڑے
کھرے شاعر ہیں۔ یعنی نہ ان کے دل میں چور ہے، نہ ان کے دماغ میں لکنت؛ اس
وقت کے دوسرے شاعر امیر نے اپنی شاعری کی ابتدا لکھنوی ماحول میں کی لیکن پھر وہ

بھی داغ کے زیر اثر آگئے۔ لیکن کسی نئے تجربے کے بغیر صرف اظہار کی خوبی سے غزل کا ارتقا جاری نہیں رہ سکتا۔ انہی شاعروں اور متاثرین کی غزل کے رجحان میں حالی نے غزل کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی تھی۔

اکبر اور چکبست، حالی کی جدت پسندی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے اپنے انداز میں غزل کی روایت کو بھی اپنایا اور اس میں نئے موضوعات کا کامیابی سے اضافہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اکبر کے مد نظر تہذیبی اور معاشرتی مسائل تھے اور انہوں نے ان مسائل کو کہیں سنجیدہ مگر طنز پر اور مزاحیہ انداز میں روایت کو سامنے رکھتے ہوئے نظم کیا چکبست کی غزل حسن و عشق کے معاملات کی شاعری نہیں بلکہ اس میں ترقی اور ملکی مسائل کا ذکر ہے مگر انہوں نے غزل کی روایت کو نہ پھوڑا۔ البتہ وہ اظہار و بیان کا کوئی نیا تجربہ نہ کر سکے۔

اس مرحلے پر اقبال سامنے آئے جنہوں نے غالب کی غزل کی روایت کو اپنا کر اس کو نئے تجربات سے بھی متعارف کرایا اور اردو غزل کے ہاتھ میں ایک ایسی مشعل بھی تھما دی جس کی روشنی ان کے بعد آنے والے طویل زمانوں تک چمکتی چلی جاتے گی۔ اقبال کو بھی غالب ہی کی طرح زندگی کو پہچاننے اور اسے قریب سے دیکھنے کا شغف تھا۔ اور انہوں نے ہر دم رواں اور متحرک زندگی کے ایک ایک پہلو ایک ایک جھلک کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا۔ اور پھر اس کے مسائل کے حل تلاش کرنے میں منہمک ہو گئے۔ غالب نے اردو غزل کو فکر دی اور اقبال نے اس فکر کو فلسفے کی روشنی دے کر اسے وسعت سے ہم کنار کیا۔ داغ کا شاگرد ہونے کے ناتے سے شروع شروع میں اقبال پر روایت کے اثرات رہے لیکن اصل میں ”اقبال، داغ کی طرح نہ تو صرف محض شاعر تھے اور نہ حالی کی طرح مانگے مانگے لی عقل پر گزارا کر رہے تھے بلکہ وہ اپنے عہد کے بلند ترین فکری، سائنسی اور ادبی معیاروں

کو اپنی نئی شخصیت کا جزو بنا کر قوم کی فکری و عملی زندگی میں ہمہ گیر انقلاب دیکھنے کے آرزو مند تھے اور چونکہ اقبال کی شاعری ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے اس لئے شعور کے پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال اُردو غزل کی روایت میں اپنے مزاج سے مطابقت رکھنے والے رنگوں کا اضافہ کرتے رہے۔ انہوں نے اُردو غزل کے سانچوں سے مکمل طور پر بغاوت نہیں کی بلکہ کلاسیکی طرز میں سے خوبسورتی کو چن لیا اور اس کو نئی معنویت اور نیا شعور بخشا۔ اقبال کی بڑائی یہ ہے کہ اپنی تخلیقی کاوشوں کی تہذیب میں روایت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسے نئی فکری رفعتیں عطا کی ہیں اور تیشہ تصور سے موجودات اور مابعد الطبیعیات دونوں پہاڑ تراش کر عاشق کی سہیلی پر رکھ دیئے۔۔۔ اقبال۔۔۔

غزل کے بنیادی جذبہ یعنی عشق کو قبول کر لیتے ہیں لیکن اسے متصوفانہ انفعالیات کے بجائے ایک فعال طاقت کا روپ دیتے ہوئے محرک کائنات کے محرک تصور انقلاب آفرینی کا مظہر بنا دیتے ہیں اور اس طرح اقبال کی شاعری کے آئینے میں زندگی اور جمالِ زندگی منعکس ہونے لگتے ہیں اور اقبال کی شاعری پڑھتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ :

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
 کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں
 شمس الرحمن فاروقی کہتے ہیں کہ ”اقبال نے اُردو نظم کی زبان یکسر بدل
 دی لیکن ان کا بہترین جوہر نظم ہی میں صرف ہوا۔ غزل کو انہوں نے اپنے
 بہترین لمحے کم کم ہی دیئے“ اور ”اقبال بہت بڑے شاعر تھے اس لئے انہوں

۱۔ فتح محمد ملک ”تعبات“ غزل اور نئی غزل، ص ۱۴۷

۲۔ ڈاکٹر صہب زوق ”نون“ غزل نمبر ۶۹، اُردو غزل کے نئے زاویے، ص ۸۱-۸۲

نے چند اچھی غزلیں بھی کہیں، حالانکہ اسی بڑے شاعر کے کم کم لمحوں کی توجہ، ہی نے ”اُردو غزل کو نیا ہجر، نیا آہنگ اور نئے تلازمات بخشے۔۔۔۔۔ ان سب کا تعلق ایک طرف غزل کی روایت سے مستحکم طور پر قائم ہے اور دوسری طرف اظہار کا یہ سرمایہ اپنے دور کی اجتماعی حقیقتوں کی بڑے والہانہ انداز میں تشریح و تعبیر کرتا ہے، پھر ویسے بھی اقبال نے تو ”نظموں میں بھی اپنی نے نوازی کی طرف اشارہ کیا تو اسے غزل ہی سے منسوب کیا:

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اور اقبال کی نظموں سے قطع نظر اگر خالص ان کی غزلوں سے ان کا پیام ترتیب دیا جائے تو جب بھی اس خوبصورتی، صفائی اور مروانہ جلال و جمال کے ساتھ غزل کے آئینے میں ان کے مردِ مومن کے خدو خال واضح ہو جاتے ہیں؛

اقبال پہلے بڑے شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف قومی، ملکی، سیاسی اور اقتصادی مسائل پر کھل کر لکھا بلکہ انہوں نے اپنے مذہب یعنی اسلام کے سمندر کی وسعت کو خود محسوس کیا اور اسی احساس کی سرشاری نے انہیں وہ گہرائی اور وسعتِ دل و دماغ عطا کی جو ان کی شاعری کی دنیا میں انسانیت پر اعتماد اور انسان کا احترام کرنے اور اس کے ارتقا کے بھول کھلانے اور آفاقیت کی خوشبو پھیلانے کا باعث بنی۔

اقبال نے جہاں غزل میں الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال کر کے اسے آگے

۱۔ شمس الرحمن فاروقی ”نون“ غزل نمبر ۶ (ہندوستان میں غزل) ص ۲۲

۲۔ ڈاکٹر صغیتہ فوق ”نون“ جدید غزل نمبر ۶ (اُردو غزل کے نئے زاویے) ص ۸۳

۳۔ فتح محمد ملک ”تعبیحات“ (غزل اور نئی غزل) ص ۱۳۸

۴۔ احمد شمیم ”ادب لطیف“ اپریل مئی ۵۵ء (غزل کا مستقبل)

بڑھنے نے کئی راستے دکھا دیئے وہیں غزل میں ایسے مضامین کو برتا جو اس سے پہلے یا تو سوچے ہی نہیں جاسکے تھے اور اگر کبھی خیال میں آتے بھی تھے تو ان کا اظہار نظم میں کر دیا جاتا تھا۔ یوں اقبال نے حالی کے بعض نظریات سے اختلاف کے باوجود ان کی یہ خواہش ضرور پوری کر دی کہ غزل کو ”ہر قسم کے جذبات کا آگن“ بنایا جائے اور اردو غزل، جب نشیب فراز سے پُر بہت لمبا راستہ طے کرتی ہوتی، دلی، میر اور غالب کے زمانوں میں سونا بکھیرتی ہوئی ان کے پاس آئی تو اقبال نے اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا کر اسے ایک ایسے بلند پرکشش اور روشن مقام پر پہنچا دیا جہاں سے وہ ہر آنے والے شاعر کی توجہ اپنی جانب کھینچتی رہی۔ صرف وہ لوگ اس نور سے محروم رہے جنہوں نے یا تو غزل کو صرف کلاسیکی روایت کی قید میں گرفتار رہنے دیا یا پھر اس روشنی کو اپنے اندر اترا تا محسوس کر کے جان بوجھ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

اقبال کے ساتھ ساتھ ہم عصر اور کچھ بعد میں آنے والے شعرا نے نظم کی ترقی اور مقبولیت کے باوجود غزل کی طرف توجہ دی اور ثابت کیا کہ غزل ایک زندہ صنف ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جدید غزل کی چھت کو مزید وسعت دینے کے لئے ان رنگ رنگے نئے نئے ستونوں کی قطار کھڑی ہو گئی۔ ان میں شاد، حسرت، اصغر، آرزو، فانی، جگر، یگانہ، اختر شیرانی، حفیظ، جوش اور پھر فراق حبیبے شعرا شامل ہیں۔ ان میں ہر ایک نے کلاسیکی اردو غزل کے کسی نہ کسی روایتی انداز کو اپنایا اور پھر اس میں اپنے زمانے کی تازگی، توازن، تناسب اور اعتدال کو شامل کیا۔

شاد کے کلام میں ایک ایسا اضطراب ملتا ہے جو اپنے تیزی سے بدلتے زمانے کے حالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاد حقیقت پسند ہیں اور ان کی شاعری میں مصوری کے ایسے نمونے ہیں جو اپنے دور کے جمالیاتی اضطراب کے عکاس ہیں۔

حسرت جدید غزل کا ایک خوش رنگ ستون ہیں۔ اردو غزل میں ان کا سب

سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ایک طرف انہوں نے غزل کو اس زہد پسندی Puritanism سے بچایا جسے ہاکی رواج دینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف انہوں نے غزل کو اس سطحی معاملہ بندی سے نجات دلائی جسے داغ اور امیر پورے ہندوستان میں مقبول بنا چکے تھے۔ حسرت نے اپنی غزل میں سہلِ ممتنع کو انتہائی ترقی یافتہ صورت دی۔ "حسرت نے مشقِ سخن اور چمکی کی مشقت کو ایک سال قبول کر کے نئے دور کے ٹبھتے ہوئے تہذیبی، سیاسی اور سماجی تقاضوں کو پورا کیا؛ انہوں نے زمینی حقیقتوں سے عشق کیا "ان کا عاشق فرشتہ نہیں انسان ہے؛ ان کا جذبہ محبت بیمار نہیں صحت مند ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت نے انہیں زندگی کی مشکلات کو وسعتِ نظر سے دیکھنے کا حوصلہ دیا۔ یوں حسرت کے ہاں زندگی کی مستریں جھلملاتی ہیں۔ وہ مسرت کو انسانی زندگی کی منزل سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اپنے جذبہ عشق کے ذریعے ایک تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ وہ عشق میں پُر خلوص ہیں۔ اس لئے ان کی بے باکی بھی ایک معصوم شوخی کا لبادہ اڑھ لیتی ہے۔ "حسرت نے اپنے دور کی سماجی توانائیوں سے مدد لے کر عشقیہ تجربات میں جو گرمیاں بھر دی ہیں، ان سے غزل کے سلسلہ اظہار میں بڑی سعیں آئی ہیں؛ یہ درست ہے کہ "ان کی غزل میں فلسفیانہ اور منکرانہ گہرائی نہیں لیکن بقول پروفیسر فراق اتنی نرم اور رچی ہوئی حزل گوئی اور اتنی حیرت انگیز نچنگی کسی کے

۱۔ نظیر صدیقی۔ "نون" جدید غزل نمبر ۶۹ جدید غزل پاکستان ہندوستان میں ۱ ص ۱۵۴

۲۔ حنیف فوق۔ "نون" جدید غزل نمبر ۶۹ دُرد و غزل کے نئے راویے ص ۸۴۔

۳۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ۔ "دُرد و ادب" ۱۹۶۶ء ص ۱۳۳

۴۔ ڈاکٹر حنیف فوق۔ "نون" جدید غزل نمبر ۶۹ دُرد و غزل کے نئے راویے ص ۸۴۔

یہاں نہیں، جہاں تک اندازِ بیان کا تعلق ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اسالیب اور دورِ جدید کے مذاق کے خوشگوار امتزاج کے ذریعے غزل میں جان ڈالی۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان کے اشعار سہل ممتنع کی بہترین مثالیں ہیں۔ جن میں پیارِ محبت کی چھوٹی چھوٹی مگر خوبصورت باتوں کی تفصیل اکٹھی ہو گئی ہے۔ جب حسرت کی شاعری کو ان کے زمانے کے پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو ان کی شاعری جدید غزل کا ایک حصہ معلوم ہو گی۔

ادھر حسرت عشقیہ شاعری کر رہے تھے اور ادھر اصغر صوفیانہ شاعری نونسی جہتوں سے آشنا کر رہے تھے۔ اصغر کی شاعری کا انداز میر درد کی متصوفانہ شاعری سے مماثلت نہیں رکھتا بلکہ اس سے مختلف ہے۔ میر درد نے جب اپنے زمانے کی حادثات سے بڑھ کر فضا میں رہ کر صوفیانہ شاعری کی تو اس میں زندگی کی بے شباتی کو محسوس کراتی ہوئی دردناک لہریں اٹھتی ہیں جب کہ اصغر کے یہاں اس کے بنیادی معنی صرشتا دوستی اور بے خودی کی کیفیات ہیں جو اپنے زمانے کی رجائیت کی پروردہ ہیں۔ یوں انہوں نے تصوف میں تازگی اور خوشگوازی پیدا کی۔ اصغر کی شاعری زندگی کے ٹھوس حقائق اور اس کی پیچیدگیوں کا اظہار نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود وہ عمل کرنے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔

آرزو نے اردو غزل کو خالص اردو کا لبادہ اس طرح پہنایا کہ غزل کے مزاج کو کوئی ٹھیس نہ پہنچی۔ ان کی غزل کی سُرلی بانسری میں نغمہ ہندی کی نرمی اور لطافت اور گفٹار

۱۔ ڈاکٹر سید عبدالقدیر "اردو ادب ۱۸۵۷-۱۹۶۶" ص ۱۳۳

۲۔ نظیر صدیقی "نمون" جدید غزل نمبر ۶۹ جدید غزل پاکستان ہندوستان میں ص ۱۵۴

۳۔ خورشید آسن صدیقی "غزل کے جدید رجحانات" "افکار" ۶۰

اُردو کی شیرینی اور سحر سازی ملتی ہے۔

کالی گھٹا میں کوندا پیکا، رو کے جو کو تل کوک گئی

جتنی گہری سانس کھینچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

یہ انداز انفرادیت، سادگی، دلکشی اور نیا پن لئے ہوتے ہے۔ بیشک اس میں کہیں کہیں بناوٹ کا احساس ضرور ہوتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی غزل کا موضوع محدود ہے لیکن انہوں نے جو کچھ کہا اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عوام سے قریب کی زبان میں بھی اچھی شاعری کی جاسکتی ہے اور اس میں بھی انسان کے عام جذبات اور اس کے نفسیاتی موضوعات کو دل نشیں انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے:

چُپ ایک پہلی ہے سوچو گے تو بوجھو گے

تم سے وہی کہنا ہے جو سب سے چُپا نا ہے

دقتاً ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے

ابھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

”اُردو لکھنوی کے تجربات نے اُردو شاعری میں کوئی زبردست دھماکہ پیدا نہیں کیا لیکن ان کے تجربات بالکل رائیگاں بھی نہیں گئے۔“ نیاز فتح پوری کے نزدیک ”اُردو صاحب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ان کی شاعری کا نشوونما لکھنؤ کی فضا میں ہوا، وہ یہاں کی روایتی شاعری سے بالکل متاثر نہیں ہوئے

۱۔ ڈاکٹر حفیظ فزوی، ”نون“ جدید غزل نمبر ۶۹، اُردو غزل کے نئے زاویے، ص ۹۱۔

۲۔ نظیر صدیقی، ”نون“ جدید غزل نمبر ۶۹، جدید غزل پاکستان ہندوستان میں، ص ۱۶۱۔

اور انہوں نے تقلید و اتباع کو چھوڑ کر اپنا رنگ بالکل علیحدہ اختیار کیا اور جدید رجحانات کا ساتھ دینے میں اپنی زبان کو قائم رکھتے ہوئے ترقی کے بہت سے امکانات پیدا کر دیئے۔ اس خصوصیت میں ان کے دور کا کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔

اصغر تو متصوفانہ رجحانات رکھنے کے ساتھ ساتھ رجحانی طبیعت کے مالک تھے اس لئے وہ اس دنیا، اس زندگی سے پیار کرتے تھے جبکہ فانی نے اپنے حالات کو اپنے مزاج کا ساتھ دیتے نہ دیکھا تو زندگی ہی سے بغاوت کر دی۔ لیکن اس کے باوجود وہ خود کشی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو صرف اس لئے بڑا کہتے ہیں کہ انہیں اس کی موجودہ صورت پسند نہیں جو تیر نیم کش کی مانند ایک مسلسل خلش کا باعث ہے۔ ان کے زمانے میں سانس لینے والے لوگ اپنے منجمد، یخ کر دینے والے حالات کو پھلا کر انہیں بدل دینے کی جدوجہد کرتے تھے لیکن منزل تک جانے والے راستے کا ابھی تک تعین نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ایک کش مکش، ایک غم، ایک گھٹن کی دھند سی چھائی ہوئی تھی، جس سے گھبرا کر ہڈ ب اور شائستہ فانی نے جو کھل کر رو بھی نہیں سکتے تھے، انہیں بند کر لیں اور اپنے ہی اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگے:

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اٹا آتا ہے

دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

”فانی نے تقدیر کی بے رحم جبریت کا تصور پیش کیا۔۔۔ یہ تصور اپنے دور کی سیاسی و

سماجی صورت حال کے خلاف جس میں ابھی تک جدوجہد کی کامرانی کے نقوش ابھرنے نہیں پاتے تھے، احتجاج کی حیثیت تو رکھتا ہے۔ لیکن سماجی جدوجہد سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نتیجہ بھی ہے۔ فانی نے زندگی سے راہ فرار حاصل کر کے موت کی گود میں چھپ جانا

۱۔ نیاز فتح پوری ”نگار“ جنوری و فروری ۱۹۳۲ء، تلخیص و تبصرہ، ص ۶۸

۲۔ حنیف نون۔ ”نون“ جدید غزل نمبر ۶۹، اردو غزل کے زاویے، ص ۸۶

چاہا، جوان کے خیال میں ایک پرسکون مقام ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی کو یقین تھا کہ موت کے بعد ان کی ساری تمنائیں، ساری خواہشیں جو یہاں کسی نہ کسی وجہ سے پوری نہیں ہو سکتیں وہاں پوری کر دی جائیں گی۔ انہیں موت کی سیاہ رات میں روشن ستارے جھلکاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ اس دنیا کی زندگی کی چکا چوند سے آنکھیں چڑا کر اس دنیا کی زندگی کی مدھم مدھم ٹھنڈی، پرسکون روشنی کی جانب دیکھنے لگے۔ یوں انہوں نے ایک طرز کی زندگی کو برا کہتے ہوئے دوسری طرز کی زندگی کا ہاتھ تھام لیا یعنی بہر حال انہوں نے اپنا یا بھی تو زندگی ہی کو اپنایا۔ وہ سمجھتے تھے کہ موت کے بظاہر پرسکون گھونگھٹ کے پیچھے ایک خوش رنگ زندگی سانس لے رہی ہے اور اسی دلہن کی خوبصورتی اور عنایتی کو اپنے تصورات میں سمجھا کر اس کے ملاپ کے انتظار میں انہوں نے اس جہاں کی ناپسندیدہ زندگی سے بھی ایک طویل عمر تک سانسیں سمیٹیں۔ اپنے بارے میں ”نگار“ ۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں: ”میں ۱۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں“۔ ویسے تو موت کی آرزو اور دشاہری میں کوئی نئی چیز نہیں لیکن انہوں نے جس شدت کے ساتھ موت کی آرزو کی اور جتنے حسین اور موثر پیرائے میں اس آرزو کو ظاہر کیا اس سے اردو غزل میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا۔ فانی کی زندگی میں جو فنا ہو جانے کی ایک ٹرپ تھی اس نے انہیں سوزِ غم بخشا۔ ان کے فلسفہ غم نے ان کی شاعری کو وسعت بھی دی اور گہرائی بھی۔ فانی کی شاعری نامرادی کی ماتم گسار ہے لیکن ان کے یہاں انسانی عظمت کا تصور اس کی تقدیر کی الماکی کے احساس کے باوجود برقرار رہا ہے اور یہ ان کی شاعری کا روشن پہلو ہے۔“

۱۔ فانی بدایونی۔ ”نگار“ ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۴۵

۲۔ نظیر صدیقی۔ ”فنون“ جدید غزل نمبر ۶۹ جدید غزل پاکستان ہندوستان میں ص ۱۵۵

۳۔ ڈاکٹر حنیف فون۔ ”فنون“ جدید غزل نمبر ۶۹ اردو غزل کے نئے زاویے ص ۸۶

یہ درست ہے کہ فانی کا دائرہ موضوع تنگ ہے اور کبھی کبھی اتنا دینے والی یکسانی اور غنودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ”مگر یہ غنودگی ہے بڑی بلیغ اور پر کیفیت“ فانی نے صرف ایک حقیقت یعنی فنا کو ہی شاعری میں نہیں ڈھالا بلکہ ان کی شاعری میں ایک پُرخلوص محبت کی ڈھکی چھپی ناکامی بھی جھلکتی ہے۔ چونکہ فانی ایک مہذب اور شائستہ مزاج رکھتے تھے اس لئے ان کے ”یہاں شروع سے آخر تک عشق کی پاکیزگی اور حسن کی لطافت کا احساس غالب ہے“

فانی کو اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں غالب نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اور انہوں نے غالب کی شاعری سے بے حد ذہانت اور خوبصورتی سے استفادہ کیا۔

یہ اثر بالواسطہ نہیں بلکہ بلاواسطہ ہے۔ وہ غالب کی فکر سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس وجہ سے ”فانی کی شاعری میں روایتی کلام سے الگ ایک ذہنی و فکری رجحان ملتا ہے“ ان کے یہاں غالب کی شوخی اور خوش مزاجی تو نہیں لیکن کئی بے حد اچھے طنزیہ اشعار بھی کہہ جاتے ہیں۔

بھلیوں سے عزبت میں کچھ بھرم تو باقی ہے

جل گیا مکاں، یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

فانی کا انداز بیان اپنے ہم عصر شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے ”یہاں فلسفہ طرازی“ غم، تغزل، زبان سمجھی کا استزاج ہوتا ہے۔۔۔۔۔ فانی کے یہاں غم ہے تو غم کا عرفان بھی ہے۔۔۔۔۔ وہ فلسفی نہیں لیکن فلسفیانہ استدلال یا طرز بیان رکھتے ہیں۔ وہ

۱۔ پرندیسر محبوں گور کھپوری ”نگار“ ۱۹۴۲ء ص ۴۶

۲۔ ابواللیث صدیقی ”غزل اور متغزلین“ ص ۲۲۲

۳۔ سجاد باقر رضوی ”تہذیب و تخیل (فانی بدایونی) ص ۱۷۵

خودی کانشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
اس میں ایک ایسے انسان کے احساسات و کیفیات کا ذکر ہے جس نے اس وسیع تر
کائنات میں اپنے وجود کی حیثیت کو شناخت کر لیا:

ہنسی میں وعدہ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو، دہی کل، آج بن کے آنے گیا

گستاہ زندہ دلی کہیے یا دل آزادی
کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا
کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا بگھ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آنے گیا

یگانہ کو غالب کی طرح اپنے زمانے نے نہ پہچانا۔ لیکن غالب کو ہزار ناکامیوں
کے باوجود اتنا یقین ضرور ہو گیا تھا کہ اب نہیں تو آنے والا زمانہ ان کی قدر کرے گا۔
اس اعتماد نے انہیں مکمل طور پر پالوس نہیں ہونے دیا۔ جبکہ یگانہ کو اپنے غسرنے قبول
کرنے سے انکار کیا تو وہ بھپر گئے۔ اسے اپنی شکست سمجھا اور تڑپ اٹھے۔ پھر اپنی ہی
انفرادیت کی قوت لے کر جب وہ شدت سے پکے تو ان کا مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار کے
زمانے سے شدید تصادم ہو گیا اور اس سے جو دھواں اٹھا وہ فرد اور معاشرے
کے ٹٹتے رشتے کا علم بن گیا جو پہلے اس طرح اُردو شاعری میں کبھی نہیں بلند ہوا تھا۔
وہ ”پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبرانی رُخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سچی دیکھار کا دلولہ پیدا کرتے ہیں“

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوک سے
زمانے کے بلند دلپست کا ہموار ہو جانا

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانے یا ہنس
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی
یگانہ کی شاعری غالب کے بعد پہلی بار قوت سے بھر پور انسانی زندگی کی نئی تصویر بن گئی۔
انہوں نے نئے خیالات کی تازہ خوشبو پھیلانی اور خوبصورت جواں لہجہ رکھا۔
یگانہ نے غالب سے آنکھیں چرانا چاہی تھیں۔ انہوں نے ”غالب شکن“ ہونے کا
دعویٰ شاید اس لئے کیا ہوگا کہ انہیں معلوم تھا کہ غالب بہت بڑا شاعر ہے اور وہ اس
سوچ کو جھٹلاتے ہوئے بھی جانتے تھے کہ وہ خود جتنے بھی اونچے ہوں غالب کو نیچا نہیں
دکھا سکتے۔ تب ہی تو سورج جیسے غالب کی کرنوں سے چھپ کر سائے سائے چلنے
کی کوشش کے باوجود ان کرنوں کی تیش سے نہ بچ سکے۔ اس لئے کہ اس دھوپ کی ان
کے مزاج کو ضرورت تھی :

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے، اب ترک دعا کرتے ہیں

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

آ رہی ہے یہ صدا کان میں دیوانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد نئے دیوانوں سے

پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا یگانہ کیوں اُخدا تی ہو چکی! بس؟

میں پیمبر نہیں، یگانہ سہی اس سے کیا کسر شان میں آئی

اپنے زمانے اور غالب کے خلاف ردِ عمل کی بھی ایک وجہ تھی۔ زمانے نے نہ تو انہیں دنیاوی سکون دیا نہ ذہنی۔ انہوں نے ایک امیر مگر پریشان حال گھرانے میں پرورش پائی۔ ایسے گھرانوں کی سب سے بڑی دولت خود داری ہوتی ہے اور جب خود داری کو ٹھیس لگے تو وہ خود پرستی کی حدود تک بکھر جاتی ہے۔ یگانہ حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے لوگ جب مایوس ہوں تو یا تو کم ہمتی میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اذیت دینے لگتے ہیں یا پھر بچے کھچے حوصلے کو سمیٹ کر مقابلے کے لئے ڈٹ جاتے ہیں اور انتقام لینے کی اور ہر شے کو مسخر کرنے کی سوچنے لگتے ہیں۔ یگانہ مایوس ہو کر جب اپنے آپ سے الجھ پڑے تو انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان کی اپنی انفرادیت بہت طاقتور ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس طاقت کو ماننے والا کم از کم اُس وقت سوائے یگانہ کے کوئی اور نہ تھا۔ ”طبیعت کی جھنجھلاہٹ، ضرورت سے زیادہ سنجیدگی اور خلوص کا نتیجہ یہ تھا کہ یگانہ کی طبیعت میں مزاج کا کوئی عنصر باقی نہ رہ گیا اور وہ اپنی ”انا“ کی حفاظت میں جو ہر گھڑی گرد پیش سے مجروح ہوتی رہتی تھی، انسانیت پسند ہو گئے“ ان کی نظر میں نہ صرف اپنے ماحول کی لپٹی نمایاں ہوتی بلکہ بڑی اور چھپی

چیزیں بھی مسخ دکھائی دینے لگیں جن میں غالب کا فن اور یگانہ کے اپنے ہی محبوب کا حسن بھی شامل ہے۔ اپنی محبوبہ سے بے نیازی کی ایک روایت یگانہ ہی سے چلی جو آن تک قائم ہے، شدت کے ردِ عمل اور بغاوت نے ”ان کے کلام میں توازن اور اعتدال کو بڑا صدمہ پہنچایا۔۔۔۔۔ اس معاملہ میں وہ حد سے بڑھ گئے“ اسی وجہ سے ان کے ہاں نرمی اور حلاوت کی کمی ہوئی لیکن اس سب کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ”اسی کش مکش اور رد و بدل کی منزلوں سے گزر کر یگانہ اردو غزل کو نئے تیور اور جدید آہنگ اظہار دینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں“ ترقی پسندی کے بھی واضح رجحانات ان کی غزلوں میں ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا خیال کئے بغیر ہم یگانہ کو صحیح طور پر کبھی نہیں پہچان سکتے، نہ ہی ان کی غزلوں کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ باقی رہیں ان کی شاعری کی کچھ خامیاں تو ہمیں وہ برداشت کرنا چاہئیں، اس لئے کہ ایک فن کار نے اپنے ایک مضمون میں کہا تھا ”زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے،۔۔۔۔۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں“ اور یہ ماننے والی بات ہے کہ یگانہ جو کچھ ہیں اس کے بنانے میں ان کے زمانے کا بہت ہاتھ ہے۔

-
- ۱۔ سجاد باقر رضوی۔ ”تہذیب و تخلیق“ ص ۱۸۷۔
 ۲۔ ابواللیث صدیقی۔ ”غزل اور متغزلین“ ص ۲۴۴۔
 ۳۔ حنیف ذوق۔ ”فنون“ جدید غزل نمبر ۶۹۔ ص ۸۸۔
 ۴۔ سعادت حسن منٹو۔ ”ادب لطیف“ سالنامہ ۴۴ء (ادب جدید)

جگر مراد آبادی کی شاعری مستی میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اس جھومتی ہونے شاعری میں بھی دقت کے ”ساتھ ساتھ ان کا سماجی اور سیاسی شعور بیدار ہوتا چلا گیا“ جگر کے اشعار کی خوبی ان کی سادگی اور برجستگی ہے۔ جگر کو تہذیبی روایات سے آشنائی تھی۔ ان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا چاہے خمریات کے بارے میں چاہے عشق کے بارے میں، سب ان کے اپنے ہی تجربات تھے۔ جگر کو رونے دھونے سے دلچسپی نہیں تھی۔ بس سرشاری و مستی کو اپناتے تھے۔ جدیدیت کو ذہنی طور پر قبول کر لینے کے باوجود ان کے کلام میں جدید رنگ کچھ زیادہ چمک نہیں پایا، دھندلا ہی رہ گیا۔ اور جب ذرا چمکنے لگا تو وہ ان کا بالکل آخری دور تھا۔

اختر شیرانی نظم کے شاعر ہیں۔ اردو غزل میں انہیں کوئی بہت اونچا مقام حاصل نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کے ہاں فکر کی گہرائی بھی نہیں لیکن ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اختر نے اردو کی رومانی شاعری کو ایک نیا لہجہ دیا، ان کے یہاں واضح طور پر ”محبوب عورت“ کا تصور متعین ہوا، اور اس چیز نے جدید غزل میں حسرت موہانی سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک اور حقیقت سے سارے پرے پہاڑ دیئے۔ ”رومانیت اور موسیقیت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔۔۔۔۔ ان کے ہاں ایک سچے قسم کا گداز، ایک بلند قسم کی المناکی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اختر نے اسلوب اور ان کی زبان میں جدت اور بے ساختہ پن کے باوجود سختی ہوتی ہے جو ان کے اشعار کی دلکشی بڑھا دیتی ہے“

۱۔ نظیر سدیقی۔ ”ننون“ جدید غزل نمبر ۶۹۔ ص ۱۵۷

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ”اردو ادب ۱۸۵۷ تا ۱۹۶۶ء“ ص ۱۴۵

۳۔ مجنوں گورکھپوری۔ ”نگار“ ۴۲۔ ص ۴۹

حفیظ نے اردو غزل کو غنائیت کے سُروں سے مالا مال کیا۔ حفیظ کے یہاں نئے مضمون ہیں نہ نئے اسالیب لیکن ایک نئی سادگی اور دلکشی ضرور ہے۔ الفاظ بلکہ پورے پورے فقروں کی تکرار سے کسی نے اتنا لطف پیدا نہ کیا ہوگا جتنا حفیظ نے کیا ہے۔

شوقِ وصال نئے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے

آئینہ دیکھتے، مری صورت نہ دیکھتے
میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجئے

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں

جینا اور کسے کہتے ہیں، اچھا خاصا جی تو رہا ہوں
جوشِ نظم گو شاعر ہیں اور اپنی کہی ہوئی غزلوں کو بھی نظمیں ہی کہتے ہیں اور یہ ہے
بھی درست کیونکہ ”جوش کی زبان اور ان کا اندازِ بیان، تغزل کی لطافت کے بالکل منافی
ہے۔ جوش نے اردو غزل میں جدید رنگ بھرنے کی اس طرح کوشش کی کہ اسے نئی زبان اور
نیا اندازِ بیان دیا۔ انہوں نے اردو غزل کو خیالات کی شاعری بنانے کی سعی بھی کی۔ لیکن ان کی
اپنی شاعری ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد بڑے سخت لہجے میں کہتے
ہیں کہ ”جوش کے الفاظ سے قارئین ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان اشعار
میں پُر جوش جذبات یا بلند، گہرے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اگر الفاظ سے قطع نظر کر کے

دیکھا جائے تو مضمون نہایت معمولی نظر آئے گا۔۔۔۔۔ جو دل پر گزرتی ہے اس کی وہ عکاسی نہیں کرتے؟

یوں اقبال نے جدید غزل کے لئے جو راستہ بنایا، شاد، حسرت، اصغر، آرزو، فانی، جگر، یگانہ، اختر شیرانی، حفیظ اور جوش وغیرہ اس راستے سے اٹلنے والی مختلف پگڈنڈیاں ہیں۔ ان سب کا سنگم فراق کی شاعری پہ ہوتا ہے۔ فراق سب کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے جدید غزل کی فصل کے لئے ایک بے حد وسیع کھیت تیار کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے سب کچھ دوسروں سے لیا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ میر کی طرف مراجعت کے باوجود انہوں نے اُردو غزل کو اپنے ذاتی تجربات کے ذریعے دیا بھی بہت کچھ ہے۔ ”فطرت کے جلوؤں، حُسن کی خوابناک اور نشاط آور کیفیتوں، جذبہ عشق کی اُداسیوں، نقیاتی تہہ داریوں، زندگی کی چھید گیوں، تہذیبی نرمیوں، انسانیت کے درد آمیز نغموں، جمالیاتی صورتوں، اپنے عصر کی انقلابی صداقتوں اور جذبہ لطیف کی پرچھائیوں کو جس عالمانہ بے خودی کے ساتھ فراق پیش کر سکتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ جدید غزل کے ارتقا میں ان کے شاعرانہ آہنگ اور لہجے کے تاثرات کا بڑا ہاتھ ہے“ یہ فراق کی خوبی ہی ہوتی کہ انہوں نے ماضی کا ہاتھ تھامنے کے بعد مستقبل کی طرف اپنا دوسرا ہاتھ بڑھا دیا۔ اب اگر قبول فراق ہی کے ان کے دل میں امیر مینائی، میر تقی میر، درد، غالب کی آوازیں اترتی گئیں اور وہ حسرت، اصغر، یگانہ، اقبال کے کلام سے بھی فیض یاب ہوتے رہتے اور فارسی شعرا سے بھی اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادب کو بھی اپنے اندریوں تکمیل کرتے رہے کہ اس کی آواز ان کی اپنی آوازیں

۱۔ کلیم الدین احمد ”نکار“ ۲۲۲ دہلی ننگار، ص ۱۱۔

۲۔ ڈاکٹر عنایت ذوق ”فنون“ جدید غزل نمبر ۶۹، ص ۹۳۔

ڈھلتی جائے تو یہ تو اچھی بات ہوتی۔ اس سے کسی بڑے شاعر کی انفرادیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ اور نکھرتی ہے۔ اسی وجہ سے تو فراق کی غزل میں روایاتِ غزل کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھرپور نئی کیفیات اور نیا آہنگ بھی ہے۔ یوں ”اپنی غزلوں میں فراق نے جدید ذہن کے فکر و احساس کو جمالیاتی آہنگ کے ساتھ پیش کیا“

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

جہاں میں ترک تعلق نہیں ہے ترکِ رسوم
وہ سامنے ہیں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چراتیں
کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی، تو کیا مر جائیں؟

برسوں ترے غم میں رو چکے ہم اب اور بھی کام دیکھیں بھالیں
فراق نے عشق کیا ہے اور عشق کی لہریں کیا گہرائیوں کو داغ کرتے ہوئے ایسی
شاعری کہ ہے جو اردو کی بہترین عشقیہ شاعری کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ انہوں نے زندگی اور

عشق کو ایک کر دیا۔ فراق کے خالص تغزل میں غزل گو شعر آ کی رہتی تلخی نہیں، نہ گردشِ فلک کا شکوہ، نہ جوڑ آسماں کی شکایت ہے۔ لیکن زندگی انقلاب کی جس دکتی ہوتی آگ، جس کش مکش اور جدوجہد سے گزر رہی ہے وہ ان غزلوں میں جھلکتا اور قریب نظر آتا ہے:

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تم نے
یہ اور بات کہ تم سے بڑی امیدیں تھیں

یہ ذلتِ عشق تیرے ہاتھوں سے دوست تجھے کہاں چھپالیں
فراق نے یگانہ کی طرح زندگی کو بے نقاب کیا لیکن دونوں کی سوچ میں بے حد
فرق ہے۔ یگانہ نے زندگی کو طنز بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس پر چوہیں بھی کہیں جبکہ
فراق نے زندگی کو اس کے دکھوں سکھوں اور خوبیوں خامیوں سمیت قبول کیا، بلکہ مزید
نکھارنے کی کوشش بھی کی۔ یوں فراق کے ہاں فانی اور یگانہ سے کہیں زیادہ وسعت اور
تنوع پیدا ہو گیا۔ فراق کو انسانیت سے پیار ہے اور اسی لئے وہ آ فانی قدردان کے
قائل ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کا جلال و جمال نئی اقدار کو ساتھ لئے لئے صدیوں تک
پھیلنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور یہیں سے ہماری شاعری حقیقتوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔
فراق کے ہاں منتخب کلام کا توازن اور تناسب نہیں لیکن یہی ان کی شاعری کے مجموعی
حسن کو ختم نہیں کرتی۔ فراق کے اسلوب میں جو نچنگی اور گھلاؤٹ ہے وہ ان کا اپنا
خاصہ ہے اور پھر ان کی شاعری کا آہنگ Rhythm جو ان کے اشعار کو بلاغت دیتا
ہے۔ فراق کے ہاں فکر و احساس کے امتزاج نے ایک نئی فصاحت قائم کی ہے۔ جو معنوی
تہیں ہم کو فراق کی غزلوں میں ملتی ہیں وہ عموماً دوسرے اور شاعروں کے ہاں نہیں ملتیں

کبھی کبھی تو ان کے دو مصرعوں میں اتنی تہہ اور گہرائیاں ہوتی ہیں کہ معنی یاب سے معنی یاب طبیعت
اندیشہ ناک ہونے لگتی ہے کہ تھاہ کہیں ملے گی بھی یا نہیں؟

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گزرا آتی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آتی
قیامِ پاکستان سے قبل ہی اُردو غزل میں ایک ایسے رجحان کی بنیاد رکھ دی گئی تھی
جس پر عالی شان عمارتِ پاکستان بننے کے بعد تعمیر ہوئی۔ اس رجحان کے زیر اثر لکھی جانے
والی غزل نے جہاں اقبال کے بعد یہ احساس دلایا کہ غزل کوئی محدود یا نری و خلیت زدہ
صنفِ سخن نہیں بلکہ وہ تو ایک کائنات ہے جس میں ہر رنگ اور ہر شکل کی اشیا، سمائی
ہوتی ہیں۔ وہیں اس غزل نے پاکستان کے ان ایام میں بھی افکار و خیالات اور جذبات و
احساسات کی سچائیوں اور انسانیت کے حقوق کے اظہار کی ذمہ داری سنبھالی جب:

ایسے غنچے بھی تو گل چیں کی تبا میں ہیں اسیر
بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں

یہ صحت مند رویہ ترقی پسند تحریک کا دیا ہوا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب اس تحریک کا
آغاز ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادب کو زندگی کی ترجمانی بھی اسی روز نصیب ہوئی حقیقت

یہ ہے کہ یہ عمل تو ہمیشہ سے جاری تھا۔ اس کو واضح طور پر بیان کرنے اور اس کا کھل کر اظہار کرنے والے اقبال تھے۔ اقبال اتنی قوت رکھتے تھے کہ جہاں ان کی روشنی نے بہتوں کو راستے سمجھائے وہیں کئی لوگوں کی آنکھیں بھی چندھیادیں۔ یوں ان کا اثر اور ان کا ردِ عمل دونوں برابر چلتے رہے اور آخر ترقی پسند تحریک میں ایک نقطے پر اکٹھے ہو گئے۔ کسی بھی تحریک کے لئے ضروری ہے کہ عظیم شخصیتیں اسے سہارا دیں اور عام مقبولیت اسے آگے چلائے۔ اس تحریک کو عظیم شخصیت تو پریم چند کی ملی جبکہ اقبال موجود تھے مگر وہ بجائے خود ایک تحریک تھے۔ ان شعر آوازوں نے اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا جن کی شاعری کی ابتدا ۲۶ء سے قبل ہو چکی تھی اور جو پڑھنے والوں سے متعارف ہو چکے تھے۔

”اس تحریک کے دو دور ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے کا اور دوسرا حصولِ آزادی کے بعد کا۔ پہلے دور کا مقصد عوام کو غلامی کی لعنت کا احساس دلا کر ان میں سیاسی شعور بیدار کرنا تھا تاکہ وہ حصولِ آزادی کی اجتماعی جدوجہد کا حصہ بن سکیں اور دوسرے دور کا نصب العین حاصل کردہ آزادی میں غیر ملکی شاطروں کی چال کو اُجاگر کرنا، آزادی کوئی نفسہ منزل قرار دینے والوں کی تکذیب اور پیدا شدہ سیاسی شعور سے گرد و پیش کے مسائل کا ادبی تجزیہ تھا۔“

”ترقی پسند تحریک زندگی اور عمل کی تحریک تھی، اس سے اردو ادب خاصا متاثر ہوا اور اس کے ادبی سرمائے میں اضافہ بھی ہوا۔ اس تحریک سے فکر و نظر میں بہت سی اہم درجیاتِ نخبش تبدیلیاں بھی پیدا ہوئیں۔“

باقی سب اصنافِ ادب کی طرح غزل بھی اس دھوپ کی زندگی نخبش تیش سے

۱۔ امین راحت چغتائی ”نون“ جدید غزل نمبر ۶۹، ادبِ دی حرت جہوں ۱۰۰۰ ص ۲۳۲

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ”جیا بان“ خامس نمبر۔ دسمبر ۶۴ء پاکستانی ادب کے دس سال، ص ۲۰۰

مخروم نہ رہی۔

اسی تحریک کے ردِ عمل میں، ۷۷ء سے پہلے ہی میراجی سکول ابھرا جس کا غالب رجحان علامت پسندی کا تھا۔ لیکن علامتوں میں ترقی پسندوں کی طرح کسی سیاسی، سماجی یا معاشی مسئلے کی وضاحت مقصود نہ تھی بلکہ ذات اور صرف اپنی ذات کا اظہار تھا۔ ان لوگوں نے نظم نگاری میں نئی نئی ہمتوں کی تلاش بھی کی۔ ان دنوں مکتبہ ہائے فکر نے اپنے اپنے طور پر اُردو شاعری میں نئی راہیں تراشیں، نئے اسالیب پیدا کئے، اور غزل کے مقابلے میں نظمیہ شاعری کو پورے عروج پر پہنچا دیا۔ ان گروہوں کی آپس میں کش مکش بھی اُردو ادب کے حق میں نیک شگون ثابت ہوئی۔ ان کی حریفانہ کوششوں نے ترقی کی منازل طے کرنے میں مدد دی، ہمیں یہاں، ۷۷ء سے پہلے کی ترقی پسند غزل پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ ترقی پسند غزل گو شعرا میں سے اہم یہ ہیں۔ فراق کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پھر فنض احمد فنض، احمد ندیم قاسمی ہیں، ظہیر کاشمیری ہیں۔ یہ لوگ، ۷۷ء سے قبل بھی اچھی غزل کہتے رہے۔

سرخسرد سے ناز کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسردی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
(فنض)

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج، گزر جائے گی سر سے
(فنض)

انسان اب کچھ نکھرے تو نکھرے سونے پڑے، ہیں شاہوں کے دربار (ندیم)

اُجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لیک رہے ہیں دوانے، اتار ہو کہ چڑھاؤ
(ندیم)

ہر گام بجلیوں سے الجھنا پڑا ظہیر
ہم وہ اسیر دائرہ اختیار تھے
(ظہیر)

بن جائیں گے ہم صبح درختوں کے پیامی
ہم قافلہ شب کی قیادت نہ کریں گے
(ظہیر)

وہ زمانہ ان فن کاروں کی شاعری کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ ان کا اصل مقام آزادی کے بعد کی غزل سے ہی متعین ہو سکتا ہے۔ ترقی پسند غزل کو تو انائی قیام پاکستان کے بعد سے ہی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ یہ تھی اردو غزل کے اس سفر کی روداد جو ابتدا سے قیام پاکستان تک پیش آئی۔ اس راہ میں آنے والے کئی سنگ میل آج بھی جگمگا رہے ہیں اور اب اگلے باب میں ابھی کی روشنی میں ہمیں، تم کے بعد کی جدید غزل کی تازگی اور انفرادیت تک پہنچنا ہے، اور یہ معلوم کرنا ہے کہ اتنے قد آور غزل گو شعرا کی نظار میں ناصر کاظمی نے اپنی انفرادیت کو کیسے تسلیم کر لیا۔

تیسرا باب

غزل کی جیات نو۔ اور ناصر کاظمی

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیا سماں سماں تھا پہلے (نامتھر)

یہ بڑا عظیم پاک و ہند جو اب پاکستان، بھارت اور نیگلہ دیش میں منقسم ہے آج سے ۲۳ سال پہلے ایک ہی ملک تھا۔۔۔ ہندوستان۔۔۔ وہ ملک ہندوستان جو مسلمانوں کی آمد سے وسعتِ قلب و نظر کا حامل ہو گیا۔ دینِ اسلام میں ویسا تعصب نہیں جو غیر مذہب پر ظلم و زیادتی کو ضروری سمجھے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو جب مسلمانوں نے دھسکانے کی بجائے ان سے قرب حاصل کیا تو یہاں کے لوگ بھی متاثر ہوئے اور یوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک سنگم بن گیا۔ یہ سنگم تھا اردو زبان۔۔۔ اردو زبان نہ صرف ہندوستان کے سیاسی حالات بلکہ سماجی و تہذیبی حالات کی بھی پیداوار ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر اردو زبان کے ماخذ کا علم ہو تو ہمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی و سماجی تعلقات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں سنسکرت اور دوسری قدیم زبانیں رائج تھیں مسلمان اپنے ساتھ عربی، فارسی لائے اور ان سب کے میل جول سے اردو زبان بنی۔

یہ تعلق خوبصورت شکل میں مغلوں کے دورِ حکومت میں پروان چڑھا۔ ہندو اور

مسلمان ایک دوسرے سے اثرات بھی لیتے اور یہ بھی خیال رکھتے کہ ان کی کسی بات سے دوسرے عقیدے کے لوگوں کو دکھ یا ناگواری نہ ہو۔ یوں تو یہ قومیں واضح طور پر دو الگ الگ قومیں تھیں لیکن میل جول سے کچھ مشترکہ خصوصیات بھی پیدا ہوئیں۔ اُردو زبان کے تار و پود میں یہ مشترکہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ غزل اُردو شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔ اُردو غزل ہندوؤں نے بھی کہی اور مسلمانوں نے بھی۔ اس طرح ان کے آپس کے تعلقات کا نکھار یوں بھی قائم رہا لیکن انگریزوں نے تو ان دونوں اقوام میں جو انسانی احترام و محبت کا جذبہ تھا اسے بھی اپنے مقاصد کے تحت ختم کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں بٹا کر اپنی حکومت کو مستحکم کر سکتے ہیں۔ اور واقعی ان کے طویل دورِ اقتدار کی وجہ صرف مغل اقتدار کا زوال ہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اعلیٰ فرانس سے غفلت بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آزادی کی جدوجہد میں سب کی کوشش ایک سی تھی۔ آہستہ آہستہ اس اتحاد میں بھی فاصلے کی دیواریں اٹھنے لگیں اور ”ہندو مسلمان بجائے انگریزی حکومت کے خلاف لڑنے کے آپس میں لڑنے لگے۔ فرقہ وارانہ فسادات مختلف مقامات پر ہوئے۔۔۔۔۔

ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کافی الگ ہو گئے زیادہ تر باتیں مذہبی نقطہ نظر سے سوچی جانے لگیں۔۔۔۔۔ مدتوں سے بزرگانِ دین اور شاہان و جہاں جگان نے جو شعوری و غیر شعوری طور پر ہندو مسلمان کو ایک کرنے کی کوشش کی تھی وہ بھی پس پشت پڑ گئی۔ صرف مذہب کو پیش پیش رکھا گیا۔ کانگریس پور اٹک چاہتی تھی جبکہ مسلم لیگ انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں سے بھی مسلمان علاقوں کی مکمل آزادی کی خواہش مند تھی۔ آخر بڑی جدوجہد اور بہت سی قربانیوں کے بعد آزادی کا مطالبہ تسلیم ہوا، لیکن فیصلہ اس طرح کیا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی کھٹ پٹ ختم نہ ہو اور وہ آپس میں لہجے

رہیں۔ ”انگریز سامراجی حکومت کا بھی منشا یہی تھا کہ ہندو مسلمان آپس میں کٹ مریں تاکہ دنیا دیکھ لے کہ انگریز جو آزادی ہندوستان کو نہیں دے رہے تھے اس کی مصلحت یہ تھی کہ یہ لوگ انتظام حکومت کے قابل نہیں تھے۔ اور واقعی انگریزوں نے یہاں کے بیشتر لوگوں کے ذہنوں اور افکار پر سیاسی اثر ڈال دیا تھا اور آخر ۲۴ سال بعد وہی ہوا جس کا انگریز مڈتوں سے منتظر تھا۔ ہندوؤں کی حمایت سے پاکستان کا ایک حصہ کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ لیکن یہ بات مقالے کے اس باب سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ آزادی اور اس کے بعد کے حالات سے ہمارا ادب اور خصوصاً شاعری کس طرح اور کس قدر متاثر ہوئی۔

تقسیم کے فوراً بعد فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔ بھارتی حیلانے گئے۔ معصوم بچوں کو والدین کے سامنے قتل کیا گیا اور عورتوں کے سامنے ان کے وارثوں کا خون بہا کر خود ان پر بھی ظلم کی انتہا کر دی گئی۔ اس وقت کی سب سے تکلیف دہ حقیقت آبادی کا تبادلہ تھی جو عام انسان کی قربانیوں کے رجحان کے باوجود بے حد کرناک تھی۔ اپنا گھر، اپنے دوست، اپنے مناظر چھوڑ کر نئی جگہ کے ماحول اور مناظر سے فوراً ہی دل لگ جانا آسان نہیں ہے۔ پھر وہ قدریں وہ معیار جن میں وہ پروان چڑھے ان کو چھوڑنا تھا اور مسلمانوں کو تو خاص طور پر ایک نیا اور اعلیٰ نظام اقتدار بنانا تھا لیکن اتنے ڈھیر دکھوں کے اندھیرے میں ایک تیز چمکتی کرن ضرور جھللا رہی تھی۔ وہ تھی امید کی کرن۔ ”تقسیم ملک کے بعد جب فسادات اور آبادی کا تبادلہ شروع ہوا تو ہندو، سکھ اور مسلمان بڑی بڑی امیدیں لے کر اپنے اپنے نئے وطن کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ ان کے

سامندہ قربانیاں تھیں جو انہوں نے اس وطن کے حصول کے لئے دی تھیں، اور وہ توقعات تھیں جن کا خوش آئند تصور بار بار ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ لیکن قائد اعظم جیسی عظیم شخصیت کی وفات کے بعد اقتدار کی ہوس سب اعلیٰ افکار، سوچوں اور تصورات کو لے ڈوبی۔ ”ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مملکتوں کے عوام میں ایک ذہنی بے چینی اور ایک سماجی اضطراب محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری معاشی بد حالی پر ہے۔ پھر یوں بھی لاکھوں انسانوں کی تباہی اور بربادی نے ان کے حساس ذہن کو ایک عظیم معاشرتی تغیر اور انسانی علم سے پُر کر دیا۔ ملک میں ایسے خانماں برباد ہاجرین کا تانا بانہہ گیا جو اپنا گھر بار سب کچھ ٹٹا کر یہاں آئے تھے۔ سیاسی حالات یوں تھے کہ اس میدان میں جس کا بھی ایک قدم سما سکتا تھا وہ پورے میدان پر قبضہ کی سازشیں شروع کر دیتا۔ ان حالات میں شاعر کو جہاں لٹے پٹے تباہ حال دکھی لوگوں کا دکھ تھا وہاں اسے یہ احساس بھی تھا کہ انہیں وہ نئی خوشیاں اور سکھ نہیں مل رہے ہیں جن کے وہ حتی دار تھے یا جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس پر کچھ شاعروں نے ان حالات کا مقابلہ کرنے، ان پر تنقید کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی فکر کی۔ کچھ شروع ہی سے اس دکھ میں اتر کر صرف غم زدہ ہو کر رہ گئے۔ آزادی اُن کو دھوکا نظر آنے لگی اور وہ افسردہ ہو کر کہنے لگے:

”وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں“

اور یہ کہہ کر: کہاں سے آئی نگارِ صبا کہ صحر کو گئی

ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خیر ہی نہیں

یہ بھی کہا کہ ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض نے اپنا تاثر لیں بیان کیا تو ندیم نے انگریز سے دھوکا کھا جانے کا ذکر اس

طرح کیا:
چہر بھیا نک تیر گی میں آگئے ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب کس دھدکے میں ہمیں پہنچا گئے
(احمد ندیم قاسمی)

فریب کھا ہی گئے اہل جستجو آخر
چراغ ڈھونڈنے آئے تھے، شام لے کے چلے (قتیل شفقانی)

بہادری لے کے آئے تھے جہاں تم وہ گھر سنان جنگل ہو گئے ہیں
انہیں صد لیل نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

شہر در شہر گھر صلاتے گئے یوں بھی جشن طرب منائے گئے
(ذناصر کاظمی)

یوں شعرا کو محسوس ہوا کہ اچھے حالات بنانے کے لئے انہیں بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ پاکستان آنے والے شعرا کو ہر نئی چیز خود بنانا تھی۔ ترقی پسندوں کی مضبوط اور بااثر تحریک جو ان نئے مطالبوں کو پورا کر سکی تھی، اپنے آپس کے نظریاتی جھگڑوں میں بکھر گئی اور سوائے چند ایک کے باقی سب شعرا اس تحریک کو عملی طور پر جاری نہ رکھ سکے۔ فتح محمد ملک کا کہنا ہے کہ ترقی پسند شاعروں کے لئے تنقیدی ہدایت نامے مرتب کرنے والے، آزادی کے تقاضوں کا صحیح شعور حاصل نہ کر سکے اس لئے طلوعِ آزادی کے فوراً بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ بہت بعد تک جسے آواز رحیل کارواں سمجھا جاتا رہا وہ

صرف ایک دروازہ درہرہ۔۔۔۔۔ احمد ندیم قاسمی کی صدائے دردناک تھی، اصل میں تحریک کی تنظیم ختم ہوتی تھی مگر تحریک کے اثرات نہیں تھمے تھے، "ترقی پسند تحریک کے بعض جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں نے محض لغزہ بازی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ انہوں نے مقصد کے مقابلے میں فن کو زیادہ اہمیت نہ دی اور ہنگامی اور وقتی تبلیغ کو ترقی پسندی سمجھ کر اس تحریک کو خاصا ضعیف پہنچایا لیکن سلجھے ہوئے دانشوروں نے افراط و تفریط سے دامن بچایا۔ وہ داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کی عکاسی کے علمبردار ہیں۔ ماضی سے رابطہ رکھتے ہوئے اور پرانی مثبت قدروں کو زندہ رکھتے ہوئے جدید رجحانات اور نئی اقدار کو اپنانے کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ حیات و کائنات کے رشتوں سے انماض برت کر اور قدم قدم پر پھیلی ہوئی برسہہ حقیقتوں سے نظریں چرا کر کوئی فن کار بھی پورے خلوص سے فن کی خدمت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، نہ ہی اس چیز کے بغیر فن میں وہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے جو اسے دل نواز، ہمہ گیر اور زندگی آموز بنائے۔ وہ اظہار کی بے ساختگی کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کو بھی شعری تخلیق کے لئے لابدی کہتے ہیں۔ غم جاناں اور غم دوراں کا حسین امتزاج ان کے فن کا طرہ امتیاز ہے۔ انہاںیت کی اعلیٰ قدروں کا حصول ان کا آدرش ہے اور ایسے معاشرے کا قیام ان کا مقصد ہے جس میں طبقاتی تفریق نہ ہو، سماجی اُدب و نیچ نہ ہو اور اقتصادی ناہمواری نہ ہو، اور ان خیالات کا شاعری میں اظہار بھی کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح کے چند ایک شعرا ایسے تھے جنہوں نے ترقی پسند رجحان کو نہ صرف آج تک برقرار رکھا ہوا ہے بلکہ اس صحت مند رجحان سے نئی نسل کو متاثر بھی کیا ہے۔ آزادی سے قبل

۱۔ نتج محمد ملک: "تغصبات"۔ ص ۱۰۳

۲۔ فارغ بخاری: "نئی قدریں"۔ بلکہ جدید نمبر، نومبر ۱۹۶۶ء آج کا شعری ادب، ص ۱۲۸-۱۲۹

ی شاعری میں اس تحریک کا رد عمل بھی شروع ہو چکا تھا اور بعض رومانی نصابوں کے شعرا اُبھرنے لگے تھے۔ رومانویت کا ایک خندہ حالات سے نزار بھی بہ ادرائے کسی قسم کے ہوں اپنا نا کھی پسند نہیں۔ رومانوی "وقت کی پابندی کرنے اور دغے کو پورا کرنے کے مخالف ہوتے ہیں" وہ مکمل "آزادی" کے خواہش مند ہوتے ہیں اور ایسے حالات میں جب لوگ پابندیوں کی حد بندیوں میں چکر کاٹ کاٹ کر الجھ جاتے ہیں تو سب زنجیریں توڑ کر جھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے میں انہیں آخر کار رومانوی فسادوں اور رومانوی افکار میں گھر کو ہی سکون ملتا ہے۔ اس لئے اس رجحان کی مقبولیت ہوتی ہے۔ سبھی تو اس وقت نہ صرف ترقی پسندوں کے رد عمل میں بلکہ ارد گرد کے حالات سے بغاوت کرنے کی خواہش نے رومانویت کو بے حد مقبول بنا دیا۔ اور یوں شعر و ادب میں ایسے رومانوی افکار سمٹ آئے جن پر مغربی اثرات کا پرتو تھا۔

جدیاتی عمل کے تحت ترقی پسند تحریک کے رجحان اور حلقہ ارباب ذوق کی نظم گوئی کے رجحان کے ملاپ سے ایک نئی شے کا وجود میں آنا لازمی امر تھا۔ اب غزل تو کسی صورت میں نئی چیز نہیں کہلا سکتی۔ اس کا سانچہ صدیوں پہلے بن چکا تھا لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ غزل کا مخصوص مزاج جسے کافی حد تک اقبال اور ترقی پسندوں نے بدل دیا تھا، اب یوں داپ آئی کہ پرانی صورت میں سے ایک بالکل نئی صورت کی کونسل پھوٹ۔ یہ کونسل اقبال اور فراق کی شاعری میں پھوٹ آئی تھی اور اسے پروان چڑھانے کا کام نہ نیم اور فیض نے انجام دیا تھا لیکن اس کو تازہ دم کرنے کا سہرا ناصر کاظمی کی غزل کے سر ہے۔ ہمیں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جو غزل دوبارہ اپنے زندگی سے بھر پور سانسوں کی ہلک بھرانے لگی تو اس کو یہ نئی زندگی حاصل کرنے میں کن حالات

نے گزنا پڑا اور اسے کن چیزوں اور کن شاعروں نے سہارا دیا۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آزادی کے وقت شعر و ادب میں کون سے غالب رجحان پرورش پارہے تھے۔ اس وقت تک اردو شاعری کی سلطنت میں وہ شاعر بھی تھے جن کے نزدیک صرف اور صرف ان کی اپنی ذات قابل توجہ کھتی۔ ان کے نزدیک حسن اور خوبصورتی کے تصورات کا بیان ہی شاعری تھا۔ وہ حقیقت کا بیان بھی اس طرح کرتے کہ اشعار کے معنی صرف انہی کے ذہنوں میں محفوظ ہوتے۔ عام قاری اپنے آپ کو شاعر کے قریب محسوس نہ کرتا۔ علامت پسند تحریک کے بعض بے راہ و شعر آنے شاعری کو اتنا نجی معاملہ بنا دیا ہے کہ قارئین اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔۔۔۔۔ اس تجربہ پدی شاعری کے مقابل میں اتنا پسند نوجوانوں نے اپنے ماضی اور اپنی شاعری کی تاریخی روایات سے یکے قطع تعلق کر کے نئے افق تک رسائی حاصل کرنے کی ٹھانی نتیجہ یہ کہ درمیان میں خلا رہ گیا جس پر پل باندھے بغیر قارئین کا اس پار پہنچنا محال ہے، لیکن تناظر در ہے کہ ان شعر آکی نظمیں اردو شاعری میں اچانک ایک نئی دنیا کی طرف در سوجھ لیتی ہیں۔ یہ در سوجھ میرا جی۔ کول کی نظم رکازن کھتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۶۶ء تک دس سال کا عرصہ اردو شاعری کی تاریخ میں بغاوت اور تحریروں کا ایک صوفانی دور ہے موضوعات میں بغاوت اور تحریروں کا سلسلہ تو دور تک پہنچتا ہے۔ بہت میں بغاوت کا احساس اس کے بعد پیدا ہو گیا۔ وہ پہلے پہل چند انفرادی کوششوں تک محدود رہتا ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے ساتھ یہ بغاوت بھپوٹ پڑتی ہے۔ سانیٹ، نظم غیر آزاد، گیتوں، نئی بحروں سے نئے پیمانوں

کے تجربے شروع ہوتے ہیں؛ لیکن ان ترقی پسند شاعروں میں سے کئی اچھے شاعر نظموں کے ساتھ غزلیں بھی کہتے رہے۔ خاص طور پر فراق، فیض، ندیم اور ظہیر کاشمیری کی غزلیں۔ ترقی پسند شعر آرڈر کے ماحول کا بیان کرتے اور اس ماحول کو، اس زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتے۔ ان کا مقصد تھا کہ معاشی مساوات اور معاشرتی خوشحالی کے لئے زمین بھوار کی جائے اور سیاسی طور پر آزادی حاصل کی جائے اور ان کے مقصد کی تان دوگو کہ سیاسی تھی لیکن زندگی کا درد اس میں ضرور سمٹ آیا تھا چنانچہ ۱۹۴۰ء کے بعد..... انہوں نے انسان دوستی کا حق ادا کیا اور قابل تدریسی لکھیں؛ اس ادب پر بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ اس نے اپنا موضوع زیادہ تر سماج کی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بنایا ہے اور ان کو وہ عریاں پیش کرتا ہے..... قاضی عبدالغفار صاحب اپنے مضمون میں اس اعتراض کو آخر کیا ضرور ہے کہ دنیائے ادب صر زبانی، ایسے ہی موضوعات کو اپنے لئے مخصوص کرے) کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ”یاد رکھیے کہ جو قومیں غلامی کی حالت میں در ماندہ ہوں ان کو ادب اور آرٹ کے محض شاعرانہ افکار کی جنت میں قدم رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ ایک بے محل عیاشی ہے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ ہمارا نیا ادب غلامی، سماجی لستی، اجتماع اور بھوک اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی خرابیوں کے ماحول میں پیدا ہوا ہے۔ اگر یہ ادب فطرتی ہے تو وہ اسی ماحول کے حقائق کو بے نقاب کرے گا، الف لیلیٰ یا داستان امیر حمزہ یا بوستان خیال تو نہیں لکھ سکتا؛ یہ الگ بات ہے کہ ہو سکتا ہے یہ سب داستانیں بھی نہیں

۱؎ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ”غزل اور متغزلین“، ص ۲۵۵

۲؎ شہاب جعفری ”ادب لطیف“، دسمبر ۱۹۹۱ء (جدید ادب)

۳؎ قاضی عبدالغفار۔ ”ادب لطیف“، سالانہ ۱۹۴۴ء (جدید ادب)

حقائق کو نقاب میں چھپاتے ہوئے ہوں لیکن اتنا واقعی درست ہے کہ فطری ادب وہی ہے جو ماحول کے حقائق کو بے نقاب کرے، چاہے یہ وسیع پیمانے پر ہوں چاہے محدود۔ ترقی پسند شعرا بشیر نظمیں ہی لکھ رہے تھے لیکن انہوں نے غزل کو بالکل ہی چھوڑ نہیں دیا تھا۔ ان کے پاس غالب اور اقبال کی غزل کا سرمایہ تھا۔ اس لئے وہ غزل میں بھی اپنے مخصوص خیالات کا اظہار کر کے اس کو وسعت بخش رہے تھے۔ ۵۳ء کے ایک مضمون میں ظ۔ انصاری لکھتے ہیں کہ ”فال نیک ہے کہ ترقی پسند نوجوان شاعروں نے اس راز کو پالیا ہے۔ وہ نظموں اور غزلوں کے موضوعاتی اور ہستی فرق کو سمجھنے لگے ہیں لہذا سمجھ کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے پچھلے پانچ چھ سال سے بڑی خوش گوار غزلیں آنے لگی ہیں جن میں غزل کی تندرست اور حسین روایات سموتی ہوئی ہیں اور اسے صحیح سمت میں بڑھا رہی ہیں۔ ان دو مختلف رجحانات رکھنے والے شعرا کی جرأت نے غزل کو نہ صرف زندگی سے قریب کر دیا بلکہ اسے اتنی تازگی بھی بخش دی کہ وہ آئندہ کسی نئے اور لمبے سفر کے لئے تیار ہو سکے۔“

آزادی کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتوں نے جس طرح شعرا کو جسمانی جھٹکوں کے علاوہ ذہنی جھٹکے دیئے اور جھنجھوڑا اس کی وجہ سے سب اس تلخ اور کڑوی زندگی کی تلخیاں محسوس کرنے لگے۔ زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف سب شعرا، خصوصاً انقلابی اور ترقی پسند شعرا نے توجہ دلائی۔ ”انقلابی شاعری جلد ہی جدید اردو شاعری کی فلرتِ ثانیہ بن گئی۔ ترقی پسند مصنفین سے متعلق شاعروں کو تنویطیت کی بجائے امید، اور وہم کی جگہ ایک ایسا یقین ملا جس نے

کم از کم وقتی طور پر سارے مسائل حل کر دیتے، وہ شعر آ بھی جو ترقی پسندوں کی مخالفت میں اس بات پر یقین نہ رکھتے تھے کہ حالات کا بیان شاعری میں کیا جائے، غزل میں ایسے ہی اشعار کہنے لگے۔ وہ صاف ظاہر ہے کہ اس وقت سب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جو آنکھیں بند کئے ہوتے تھے وہ جاگ اٹھے اور جو جاگ رہے تھے وہ لپک کر آگے بڑھ آئے۔ سبھی تیز چمکتی دھوپ میں سارے منظر اور سب چیزیں دیکھ رہے تھے اور باوجود اس کے کہ ”در اصل یہ دور بھی عبوری تھا۔ لے فنی، عدم تحفظ اور تشکک کی فضا عام تھی چنانچہ غزل گو بھی جذباتیت اور ماحول سے بے زاری اور شدید کرب میں مبتلا تھے۔ مگر با اس ہمہ جدید معیشتی زندگی اور زندگی کی کڑی دھوپ کی وجہ سے اب غزل گو اپنے مخصوص سحر آگہی حصار اور خوابی خول سے باہر نکل آئے تھے“ اور مالوسی اور احساس کمتری کی دیوار کو ڈھالتے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ کچھ لوگ تو دھوپ دھوپ چلتے ہوئے امن و سکون کا حق مانگنے لگے اور کچھ لوگ ایسے تارک حسی زدہ جنگلوں میں اتر گئے جو تیز لو سے بھی زیادہ تباہ کن تھے۔ اور کچھ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر بھی آنکھیں بند کر کے فردوس نما فضاؤں میں پہنچ گئے۔ سوچنے کا انداز سب کا الگ الگ تھا لیکن شروع شروع میں اصل بات سبھی کی ایک ہی تھی یعنی آزادی کے بعد تبدیل شدہ سیاسی، معاشی معاشرتی اور تہذیبی حالات، جن کی اس صورت میں بالکل توقع نہیں کی جا رہی تھی۔ ایسی فضا میں حساس شاعر بھی بے چینی اور بے سکونی محسوس کر رہا

تھا۔ سب باتیں کرنا چاہ رہے تھے۔ جذبات کا اظہار چاہتے تھے۔ ایسے میں نظموں سے زیادہ غزلوں نے ان کو اظہار میں سہارا اور مدد دی۔ ایک طرف تو ”نئی قدروں کی تلاش کے اس دور میں فراریت کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش میں ایک اہم بات ہوئی کہ غزل کو سنبھالا گیا اور دوسری طرف وہ شعرا جو زندگی کے مسائل کا بیان کرنا چاہتے تھے ان کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ وہ کھل کر سب کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے غزل کے لطیف اور پر معنی کنایتے، استعارے اور تشبیہیں بہت مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔ یوں بھی ”ہندوستان و پاکستان کی حکومتیں اب بدیسی نہ تھیں۔ ان کے خلافت بیا کی دوریدہ دہنی سے کچھ کہنا لباوت کے مترادف سمجھا جاسکتا تھا اور جی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اقوام عالم کے سامنے اپنی نئی حکومتوں کی نامیوں کو شد و مد سے بیان کر کے اس طرح بدنام کیا جاتے کہ وہ دنیا کی نظروں میں ابھی سے ذلیل و ناکارہ نظر آنے لگیں۔ اور تیسری اہم وجہ غزل کی مقبولیت کی یہ تھی کہ اس وقت کے زمانے کے حالات ایسے تھے کہ وہ سوچوں کو پرائی مٹی ہوئی تہذیبی اقدار کی تلاش میں میر کے زمانے تک لے گئے اور انہیں احساس ہوا کہ میر کے زمانے کے دکھ آج کے دکھوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس طرح وہ میر کو اپنے ساتھ لئے لئے اپنے زمانے تک لے آئے۔

آزادی کے فوراً بعد پہلے تو آزاد ہونے کی خوشی میں سب کچھ بھلا دیا گیا اور صرف آزاد ہونے کا ذکر کیا گیا، لیکن جب اصل باتیں سامنے آئیں تو ایک طرف تو مایوسی نے الجھے الجھے شکایتی لہجے کو جنم دیا جس میں طنز اور جھنجھلاہٹ بھی تھی۔

۱۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”نگار“ اردو ادب، آزادی کے بعد، ص ۴۱

۲۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ ”اردو ادب، آزادی کے بعد“

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزرتی ہے (فیض)

اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جاتیے، زخموں کے نگے ہیں بازار (ندیم)

کچھ اس طرح سے بہا آئی ہے کہ کھینے لگے
جو اے درد و گل سے چراغ دیدہ و دل
رداں ہے قافلہ بے در اور بے مستنورد
جو دل گرفتہ ہیں راہی تو رہنا غافل (حفیظ ہوشیار پوری)

یہ راہرو تھے کبھی راہ زندگی کا سراغ
یہ راہرو کہ بھٹکتے ہیں رہنا کے لئے (صوفی مستم)

کہہ رہا ہے فضا کا سناٹا راستے میں نہ کارواں ٹھہرے
آپ کو کارواں سے کیا مطلب آپ تو میرا کارواں ٹھہرے
(باقی صدیقی)

اور دوسری طرف احساس شکست اور احساس محرومی نے ساری فضا کو اندر
کر دیا۔ شاعری میں اندر دگی کے سب سے بڑے نمائندہ میر تقی میر تھے۔ یوں میر کی
طرف مراجعت سے نہ صرف میر کا لب و لہجہ پھر سے گونج اٹھا بلکہ قدیم کھپرتی ہونے
رد آتیں بھی مکمل طور پر فراموش ہونے سے بچ گئیں۔ اس دور میں غزل کے پڑانے

اسالیب کے مطالعے سے نئی روشیں ڈھونڈنے کی خاص کوشش ہوتی
 اس رجحان کی ایک مثال میر کی تقلید یا صحیح الفاظ میں میر کا اعتراف ہے: "میر
 مانوس نظر آیا۔ وہ اس زمانے میں چلا آیا۔ مگر اس مانوسیت میں ایک حصہ تقلیدی
 ذہنیت کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ میر میں طبع آزمائی تو بہتوں نے کی لیکن کامیابی
 کم شعر آگونیصیب ہوئی۔ زیادہ تر شعر آئے میر ہی کے بعض مضامین کو ان کے مخصوص
 الفاظ، فقیرانہ لہجے اور لمبی بحر میں ادا کرنے پر اکتفا کر لیا۔" ان کے مزاج میر
 کے مزاج سے مماثل نہ تھے۔ نہ ہی وہ میر کی طرح کا طرز احساس رکھتے تھے۔ وہ
 میر کے صرف طرز اظہار کو اپنانے کی بجائے اس کی باتوں کے چربے بھی اتارنے
 لگے۔ اور یوں اپنے بڑے فن کار کی ناکام نقل کرنے کی وجہ سے وہ خود قدم قدم پر
 ٹھوکر کھانے لگے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ "یہ مصدقہ حقیقت ہے کہ
 بعض روایتوں کی سر حالت میں حفاظت کرنی چاہیے کیونکہ ان کی قوت حیات
 ہزاروں سالہ انسانی تجربے پر مبنی ہے۔" لیکن جدید شاعری میں قدیم شاعری کو جو بہو
 کہہ دینے کا مطلب تو یہ ہوا کہ زمانہ آگے بڑھا ہی نہیں۔ جدید زمانے اور قدیم
 زمانے میں فرق تو ہوتا ہے۔ آج کل تو انسانی تہذیب کا ارتقا کچھ بہ کچھ بھی ہو رہا
 ہے کل کے دن سے آج کا دن مختلف ہے اور آنے والا کل آج سے بھی مختلف ہو
 گا۔ اتنے تیز رفتار عہد میں "ادب کی کوئی بھی صنعت ہو جب وہ ہدایت کی پابند
 اور لکیر کی فقیر ہو جاتی ہے تو اس میں نہ تازگی رہتی ہے نہ زندگی اور آنے والی

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "خیابان" پاکستانی ادب کے دس سال (ص ۲۱۰)

۲۔ نظیر صدیقی: "خیابان" دار ودغزل (کدھر؟) ص ۲۶۹

۳۔ احمد ذمیزہ سمی: "نگار" سالنامہ ۶۵ (جدید شاعری آزادی کے بعد) ص ۴۴

ہے کہ میرا درنا صر کے مزاجوں میں بہت مماثلت ہے۔

وہ شاعر جو تہی دنیاؤں اور تہی چیزوں کی تلاش میں رہتے تھے آزادی کے بعد ان کی انقلاب کی پکار کم ہو گئی اور انسانیت کا ماتم زیادہ ہو گیا۔ اب ”ملک کی آزادی یا قوم کی آزادی کے ساتھ ساتھ فرد کی آزادی کا سوال بھی ابھرا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرتی اور قومی جدوجہد کے بعد جب قومی نصب العین کا حصول ہو گیا تو اب ضرورت اس بات کی ہوئی کہ وہ لڑائی جو ذات سے باہر لڑی جا رہی تھی اسے محدود کر کے افراد کو ان کا مرکز بنا دیا جائے۔

۶۳۶ کے بعد ادبی بغاوتوں کے جو طوفان بڑے زور سے اٹھے تھے ان میں اعتدال کی کیفیت پیدا ہوئی، چنانچہ اس نئی فضا نے مصالحت اور مفاہمت کا رجحان پیدا کیا جس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ انتہا پسندی کی جگہ غور و فکر اور ملکی عناصر سے بنیاری کی بجائے ملکی اور قومی مزاج کو سمجھنے اور اس سے ہمدردی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔

غزل جو عاشقانہ مضامین اور گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی کہانی کے سوا اور زیادہ نہیں جانتی تھی اسے نئی دنیاؤں سے اقبال نے روشناس کرایا اور ۴۷ء سے کچھ عرصہ بعد تک غزل نئے رستوں پر چلتی ہوئی دستوں میں پھیل گئی۔ اب ”غزل ایک ایسی صنعت بھی معلوم ہوئی جو ایک قوم کی ذہانت و فطانت کی پیداوار ہے جس نے ہمیشہ نہ صرف اس قوم کی تہذیب اور معاشرتی نشیب و فراز کا ساتھ دیا ہے بلکہ اس نشیب و فراز کی توجہ دانی اور عکاسی بھی کی ہے۔ اس میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی باتیں ضرور

۱۰ ڈاکٹر کریم الدین۔ ”سیپ“ نئی شاعری میں تجربے، ص ۶۲۔

۱۱ ڈاکٹر سید عبداللہ ”خیابان“ دسمبر ۱۹۶۴ء پاکستانی ادب کے دس سال، ص ۲۰۱

ہیں لیکن ان کے پردے میں اس نے بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ معاشی، معاشرتی حالات کی تصویریں بھی کھینچی گئی ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر افراد کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے نقشے بھی بنائے ہیں اور زمانے کے ہاتھوں پیدا ہوتے ہوئے نئے افکار و خیالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد شعر آئیں سے چاہے کوئی ترقی پسند تھا یا رد مانوی یا کچھ اور، وہ حقیقت کی آگ کو اپنے اتنے قریب پارہا تھا کہ اس کی تلمیح سمجھی محسوس کر رہے تھے۔ ”حقیقت پسندی نے محبت اور حسن کے بارے میں بھی نیا تصور قائم کیا اور یہ نیا تصور جدید شاعروں میں کم و بیش سمجھی نے اپنایا۔“ ناصر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے یہ تصور لوں اپنایا کہ اس کی غزل پر نہ ترقی پسندی کا لیبیل لگ سکا نہ میسر پرستی کا۔ اس کی فنی تجزیاتی قوت نے قدیم و جدید غزل کی روایات و رجحانات کو اس سلیقے سے آمیخت کیا کہ ناصر کا ایک اپنا اسلوب صورت پذیر ہونے لگا اور اس اُردو غزل میں اسلوب کی یہ انفرادیت قائم کرنا کوئی آسان بات نہیں جہاں میسر، غالب، اقبال، فراق، فیض اور ندیم کے سے قد آور غزل گو اپنی غزلوں کی صورت میں نہ صرف موجود ہوں بلکہ پڑھنے والوں کے ذہنوں پر چھپائے ہوئے ہوں۔

اب تک کی غزل کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے جب ہم اس مقام پر آتے ہیں تو جس طرح آج کے شہری آدمی کو اتفاقاً دیہات کی چاندنی رات، خوشگوار دخنک صبح اور ہلکے رنگوں میں ڈوبتے ابھرتے شام کے مناظر دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مسحور ہو جاتا ہے اسی طرح قاری کو بھی غزل کی تیز چمکتی روشنیوں والی رنگ برنگی

۱۷ ڈاکٹر عبادت بریلوی ”ماحول“ - ۷ - ۸ اُردو غزل کے جدید رجحانات، ص ۲۹

۱۸ ڈاکٹر محمد حسن ”شاہراہ“ فردری ۱۵ء جدید اُردو شاعری، ص ۱۸

اور مختلف سازوں کی آوازوں سے بھر پور دنیاؤں سے گزر آنے کا احساس ہوتا ہے اور اب اس کے سامنے جو واوی پھیلی ہوئی ہے اس میں ہلکے ہلکے رنگ اور دھیمی دھیمی موسیقی ہے۔ فاموشی اور تنہائی ہے۔ اُداسی بھی ہے لیکن ایسی اُداسی نہیں جو بالوس کر دے۔ بلکہ یہ اُداسی حقیقت کی پہچان کروا کر امید بھی دلاتی ہے اور یہی ہے ناصر کاظمی کی غزل کی واوی۔۔۔۔۔ یہ نئی جگہ ہے، یہاں جو کچھ ہے پھول، پہاڑ درخت، ندیاں، رستے، یہاں کے لوگ، سبھی کچھ پہلے کے دیکھے بھالے ہیں لیکن پھر بھی یہ سب سے مختلف ہے تو آئیے اب ناصر کی واوی غزل کی اس انفرادیت کو پانے چلیں۔

ناصر کاظمی کو سب سے پہلے جس نقاد کی تنقید نے مدد دی وہ تھے محمد حسن عسکری۔ رسالہ ”ساقی“ کی جھلکیوں میں انہوں نے ناصر کی آواز کے ریلے سن اور اس کے موضوع کی گرفت کو نہایت سلیقے اور محبت کے ساتھ پیش کیا، مگر ان کے ساتھ ایک مشکل یہ تھی کہ وہ ادب میں حقیقت پسندی اور مقصدیت کے منی لفین میں شمار ہوتے تھے اس لئے انہوں نے ناصر کو حقیقت و مقصدیت سے بالکل الگ کر کے دیکھا۔ خود عسکری کا اسلوب تنقید اتنا خوبصورت تھا کہ انہوں نے قارئین کو بے حد متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ناصر کو عسکری ہی کی عنینک سے پہچاننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہر حال اہم بات یہ ہے کہ عسکری ہی نے ناصر کی عظمت کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور یہ بڑی بات ہے۔

”قیام پاکستان کے بعد اُردو غزل میں کئی نئی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں سب سے پہلے جس آواز نے اپنی انفرادیت تسلیم کرالی وہ ناصر کاظمی کی آواز تھی۔ ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری کے شاگردوں میں سے ہیں۔۔۔۔۔ ناصر کی غزلوں پر تمیز مصحفی، غالب، اقبال، اور فراق کے اثرات واضح ہیں لیکن ان کے باوجود

ان کی انفرادیت نمایاں ہے ان کی شاعری قدما کے گہرے مطالعہ اور فنی ریاضت کا ثبوت دیتی ہے؟

ناصر کاظمی کے اس انفرادی مقام کے متعلق کچھ اور آرا بھی دیکھے لیتے ہیں۔
 ”۱۹۴۶ء میں جب ناصر کاظمی نے غزل اپنائی تو وہ اسے محض ”تفریحی صنف“ نہ سمجھتے تھے بلکہ دلی سے اقبال تک اردو شاعری کا عہد بہ عہد سفران پر آئینہ تھا اور یہ کہ.....“نتی غزل کی تاریخ میں ناصر کاظمی کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا کہ انہوں نے ہر دوروں کو رد کر کے ایک نئے دور کو جنم دیا۔ ناصر کاظمی نے تو اپنی تماش بیسی کی تماش اور دوسروں کی تفریح طبع کی خاطر غزل لکھنے والوں کے فریب میں آئے اور نہ فقط پابندی اظہار کے زمانہ میں غزل کے رموز ایما سے کام نکال لینے والوں سے متعلق ہوتے بلکہ وہ یہ احساس لے کر اٹھے کہ جب تک غزل اہم ترین صنفِ سخن نہیں بن جاتی ملکِ سخن کا سماں سنان رہے گا“

”ناصر کاظمی نے غزل کی ”تجدید“ کی۔ ناصر کی غزلیں سپردگی، ربودگی، داخلیت، کھوئے کھوئے سے انداز، خود فراموشی اور نیم خوابی کے عالم کی عکاس میں۔ ناصر کا لب و لہجہ کلاسیکی غزل سے نکھر کر اور سہل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ناصر کے ہاں صرف تشبیہ و استعارہ کی تازگی اور تاثراتی تصویروں کا نیا پن ہی نہیں ہے خلوص کی ہلک اور تجربے کی روشنی بھی ہے۔ یہ محض تقلید نہیں ہے تخلیق بھی ہے گو کہ اس کا دائرہ محدود ہے“

۱۔ نظیر صدیقی۔ ”نون“ جدید غزل نمبر ۶۹ جدید غزل۔ پاکستان اور ہندوستان میں (ص ۱۶۸)

۲۔ فتح محمد ملک۔ ”تقصیبات“ وغزل اور نئی غزل (ص ۱۵۷)

۳۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ”نقوش“ جون ۶۰ء (آج کی شاعری)

”ناصر کاظمی کی غزلیں فیض، حقیقت اور مجروح سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی حیثیت ایک نئی آواز کی ہے۔ انہوں نے جو عظیم تجربہ اُردو غزل میں کیا ہے، اس نے تو غزل کی فضا ہی کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ ان کے یہاں دوسرے جدید غزل گو شعرا کی طرح غزل کی روایت کا عام ماحول نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ایک نیا ماحول قائم کیا ہے۔ ایک نئی فضا تیار کی ہے اور اس میں بڑی حد تک ان کی اس نئی Imagery کو دخل ہے جس کا تار و پود انہوں نے اپنے گرد و پیش سے لیا ہے۔“

ناصر کاظمی سب سے پہلے فراق سے متاثر ہوئے۔ اس کا انہوں نے بے شک کھل کر اظہار نہیں کیا لیکن ان کے اشعار اس کے گواہ ہیں۔ ”ناصر کاظمی کا طرز احساں شروع شروع میں فراق سے متاثر ہوا۔ اس میں بھی ”پیراڈکس“ کی جھلک ہے:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

لیکن یہ پیراڈکس بے کار Idle ہیں۔ اس بدلتے ہوئے انسان کی زندگی کے سایوں اور روشنیوں کا عکس ہے۔ پھر ناصر نے فراق کی غزلوں کا انتخاب ”غزل“ کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ بیگم ناصر کاظمی کا کہنا ہے کہ فراق کو وہ بے حد پسند کرتے تھے۔ ”ناصر کاظمی نے فراق سے کیفیتِ مثنوی کا انداز لے کر اسے جدید غزل کے ایک نئے دور کا نعرہ جہاد بنا دیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فراق تو خیر بجز دایات کے سناور ٹھہرے خود ناصر کاظمی بھی میسر سے لے کر

۱۵ ڈاکٹر عبادت بریلوی ”ادب لطیف“ ۵۵ (اُردو غزل میں ہیئت کے تجربے)

۱۶ جابر علی سید ”نون“ جدید غزل نمبر ۶۹ (جدید نظم، جدید غزل اور جدید طرز احساں)

اقبال تک مختلف لہجوں کو اپنے لہجے میں جگہ دیتے رہے ہیں؛ لیکن یہی تو عجیب بات ہے کہ ناسراں سب لہجوں کے آرکسٹرا میں اپنی آواز نمایاں رکھتے ہیں۔ ان کی صدا دبی نہیں اور اس کے باوجود وہ بلند اور تیز نہیں۔ دھیمے دھیمے ٹنروں میں، نرملی سے کچھ بتاتی ہوئی، کچھ سمجھاتی ہوئی آواز۔ لیکن اس آواز کی بھی ایک گھمبیرتا اور گونج ہے۔ اور یہی اس کی پہچان اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

اصل ناصر کاظمی، ہم کے بعد سامنے آتا ہے ایک پُر اعتماد اور باوقار غزل نے ہوتے۔ ناصر اپنے آپ کو ترقی پسندی سے الگ بتاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو رومانوی ظاہر کرتا ہے لیکن بات ترقی پسندوں ہی کی سی کرتا ہے۔ دراصل وہ حقیقت بھتی ہی ایسی قیامت کی کہ نہ ہوتے ہوتے بھی سب ایک ہو گئے تھے یہ اختلافات تو کچھ عرصے بعد واضح ہوئے۔ اس وقت جب زندگی کو سمجھنے کا مرحلہ آیا تب ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں اسے سمجھا اور اس کی ضرورتوں کا ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے سخت لہجے میں بات کی، کچھ نے نرم لہجے میں، کئی شاعروں نے بات سمجھ کر اسے سوچا اور نئی تجویزیں دیں اور کئی دوسرے شاعروں نے بات سمجھی اور اس کی طرف اشارہ کر دیا اور بس۔ یہی آپس کی کش مکش بھتی جس کے ٹکراؤ کے بعد غزل پھر سامنے آ گئی یعنی الگ الگ رجحانات غزل کے حق میں بڑے نہ تھے۔ ناصر کاظمی کو رومانوی شاعر کہا جاتا ہے لیکن اس کی رومانویت کی دھند کے پیچھے حقیقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ناصر کے سے حساس اور باشعور لوگ ہی ایسے ہو سکتے ہیں جو اس سمندر کا شور بھی سن سکیں ورنہ تو رنگ برنگی دھند ہے اور کچھ نہیں۔ اور یہی صحت مند فکر ہے جو پُر اعتماد ناصر سے کہلاتی ہے کہ ”مجھے تو ہر ایسے شخص کی دوستی پر شبہ ہونے

عمر نکلے نیت سے جو لے کر عمل صفا کو حسین

د شہید شروع ہوتے ہی نکلنے والا کربلا کے میدان میں پہنچ جاتا ہے۔ "اے اور رہنے میرے تو میرے کو انہوں نے صرف نمیشن کے لئے نہیں اپنا یا بلکہ ان کی اور ناصر کی ردحوں میں کہیں نہ کہیں سے مماثلت ضرور دھتی۔ مزاجوں میں یکسانی تھی پھر حالات بھی ایک سے ہوتے گئے۔"

"اب میری شاعری میں کس حد تک مجھے اپنی شخصیت کے کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا۔۔۔۔۔ میر کی سیدھی سادی غزلوں اور چھوٹی اور پُر سکون بچوں اور عام لفظوں کی تہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا۔۔۔۔۔ یہ اتفاق ہے کہ میر صاحب کی شاعری کے بعض اہم عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرکات میں چند باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے۔ وہی عزیز الوطنی وہی قافلوں کا سفر، وہی رہزنی، آئے دن، حکومت کا بدلنا، خوراک کی قلت، سیلاب کی تباہی اور پرانی اقدار کا بکھر جانا اور رواج سنہرے اور ونا پیشگی کا اٹھ جانا، غرض یہ حادثہ ہمیں بھی دیکھنے پڑے۔"

اپنی عزیز چیزوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ جاتے ہوئے ناصر ان چیزوں کے ماتم میں میر سے قریب آگئے لیکن انہیں نئی چیزیں بھی عزیز رہیں اس لئے وہ میر سے بالکل الگ راستے پر بھی چلے۔ ویسے میر کو انہوں نے اپنے اندر سمولیا تھا۔ ان کے قریبی دوستوں کے مطابق ناصر، میر کے کلیات کے ایک ایک ورق کے ایک ایک

۱۔ ناصر کاظمی۔ "نیادور" شمارہ ۷-۸-۸۰۔ دنیا اسم) ص ۹۹

۲۔ ناصر کاظمی۔ "سوریا" ۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان۔ میر تقی میر) ص ۲۶۲ اور ۲۷۰

شعر کی اچھائی اور خوبی سے واقف تھے۔ پھر وہ تہذیب اور وہ روایتیں جو اس وقت بائبل تباہ ہوتی اور مٹی محسوس ہو رہی تھیں ان کی بازیافت کے لئے ناصر کو میر کے زمانے تک جانا پڑا۔ ”بقول ناصر کاظمی“ میر کے زمانے کی رات ہمارے زمانے کی رات سے آگے تھی اور شاعر کے حال مستقبل میں محصور ہو کر رہ گیا تھا ایک بار پھر ”کھوئے ہوئے کی جستجو“ کرنے لگا۔ یہ جستجو اس سے پہلے کیوں نہ کی گئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے تہذیبی سانچے اپنے قدیم کے اثرات اور رنگ بھی ساتھ لیتے آئے۔ لیکن اب سب کچھ چھوڑ کر کچھ نئی چیزوں کی تعمیر کرنا تھی۔ قدیم تہذیبی سانچے اس لئے بہت عزیز ہو گئے تھے کہ نئی جگہ تو شروع شروع میں بالکل بے رنگ و بے معلوم ہوتی جہاں نئی چیزوں کی بنیادیں تک تعمیر کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ناصر کی ابتدائی شاعری کی ہمہ گیر اداسی اس صورت حال کا ردِ عمل ہے، مگر بعد میں ناصر کے اندر جو امید اور توقع اور کہیں کہیں مستقبل کے بارے میں یقین کے چراغ جلنے لگے تو ناصر کی شخصیت بھر پور انداز میں اپنا اظہار کرنے لگی۔ ”برگِ نئے“ اور ”دیوان“ کے موضوع اور لہجے میں یہی فرق ہے۔

”اس سے پہلے یہ بحث آچکی ہے کہ، ہم کے بعد اردو غزل کو پھر قبول عام حاصل ہوا مگر غزل کی اس نئی تحریک کے سلسلے میں یہ امر لائق توجہ ہے کہ اس دور میں غزل کے پُرانے اسالیب کے مطالعہ سے نئی روش ڈھونڈنے کی خاص کوشش ہوئی۔ گویا غزل کی پوری روایت شاعروں کے مد نظر رہی جس کی بنیادوں پر نئی عمارتوں کے منصوبے اٹھائے گئے۔ اس رجحان کی ایک مثال میر کی تقلید یا

نہیں تھے، بلکہ غزل میں Cliche کی پرانی ڈگر جو تھی اُس کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میاں نئی بات کرو۔ تو اگر غزل میں نئی بات کہی جاسکے اور غزل کا احوال، تمہیں پتا ہے کہ دلی شہر کا سا ہے۔ یہ بار بار اُجڑتی ہے اور بار بار بستی ہے۔ کئی بار غزل اُجڑی لیکن کئی بار یہ زندہ ہوئی اور اس کا یہی امتیاز ہے کہ غزل میں شاعری اچھی ہوتی ہے۔ شاید نظم کا اس آسانی سے پراع نہیں جلا۔ خود فیض نظم نسبتاً بین لیکن غور سے دیکھیے ان کی ساری کی ساری شاعری غزل ہے۔ تغزل ہی تغزل تو ہے جس کی وجہ سے فیض شاعر ہے تو یہ ہے۔ غزل اس لیے میں نے اختیار کیا اور جہاں تک جدید شاعری کا تعلق ہے اس میں — کچھ خیالات اُس زمانے میں سننے آنے تھے تو ان کا غزل برابر ساتھ دیتی رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے جو غزلیں میں نے کہی ہیں، میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اپنی دانست میں یہ سوچ کر کہیں کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں اور اس میں میرے عصر کی روح ہو۔

ناصر کی غزل میں ایک اور نئی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے دو مختلف انداز فکر کو گھلا ملا کر اپنی ایک تعمیری سوچ میں ڈھال لیا۔ ناصر کا ایک تو رومانوی انداز فکر ہے جس کی وجہ سے وہ فطرت سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ یوں تو ہر شاعر فطرت کے مناظر سے اپنی شاعری کو حُسن دیتا رہتا ہے لیکن اپنے ارد گرد پھیلے پیش منظر سے پرے پس منظر میں دھندلے دھندلے نیلے نیلے مناظر کو ہی دیکھے چلے جانا رومانی لوگوں کا کام ہے۔ وہ جب اپنے آپ کو حالات سے مطابق نہیں پاتے تو ان سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں مناظر و مظاہر فطرت سے دوستی کر لیتے ہیں اور اس دوستی کے نشان ناصر کے ہاں بھی ہیں، خصوصاً ”برگ بنے“ میں۔

”ناصر کاظمی کی شعری سلطنت مختلف منطوقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ تنہائی، اداسی،

فراق، یادیں، قدری زندگی کا تغیر، بچھڑنے والوں کی تلاش، ان دیکھے کی جستجو، پرین

اور خرابے اس سلطنت کے مختلف منطقے ہیں۔ اس کی اس سلطنت کا نقشہ سہمے ہوئے شہروں، ٹھٹھری ہوئی راتوں، سونے راستوں، دکھلے کنکروں اور کانٹوں، بے چراغ گلیوں، جلی ہوئی کھیتوں، پیاسی جھیلوں، بکھے دلوں کے ڈھیروں، خاموشیوں کے قفل، دھوپ کے سائبان، زخمِ دفا، آتشِ خاموش سے مرتب ہوتا ہے۔ ناصر نے اپنی سلطنت میں بعض سیرگاہیں بھی بنائی ہیں۔ جہاں انسانوں اور فطرت کا حسن اور معصومیت، منہ اندھیرے چڑیلوں کی چچا ہٹ، چاند، ستارے، شبنم، خوبصورت آنکھیں، پھول اور پھولوں جیسے انسان نظر آتے ہیں۔^۱

اس سلطنت کے بیشتر منطقے رومانویت کی دھیمی دھیمی، اُداس، مٹی سی فضا میں ہیں۔ نرم نرم آوازیں ہیں اور حسن ہی حسن ہے۔ یہ ایسی فضا ہے جہاں صرف سوچنے کو جی چاہتا ہے۔ اٹھ کر چل پڑنے یا کوئی کام کرنے یا مزید حسن ہی تعمیر کرنے کی تحریک نہیں ہوتی۔ لیکن ناصر کے ہاں تو بد صورتیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ظالم باغبان سے حسین پھولوں کو محفوظ رکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا ہے اور یہ انداز فکر مختلف ہے۔ بے شک بغاوت بھی اس انداز فکر کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن ناصر تو روایت کا احترام بھی کرتے ہیں۔ اور پھر صرف بغاوت ہی نہیں کرتے انقلاب چاہتے ہیں۔ تعمیری تبدیلیوں کے خواہش مند ہیں۔ اب ان کی سلطنت (دیوان) میں میلی چادر اڈھنے والے بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہاں پر حسن و اچھائی کو چرانے کے لئے،

۱۷ ہیں گھات میں ابھی کچھ تانے لٹیروں کے

اس لیے یہ مشورہ بھی دیئے جاتے ہیں کہ:

۱۸ ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر

وہ ”ہوائے ظلم“ کی ہی ساخت نہیں کرتے بلکہ اس سے زمین کے پانی

اور سورج کی کرن کو محفوظ رکھنے کے لیے خبردار بھی کرتے ہیں۔ اس طرح دو مختلف انداز فکر ناصر میں اکٹھے ہو گئے اور اس سنگم اور ملاپ نے ناصر کی غزل کو نہ صرف انفرادیت دی بلکہ ناصر نے اس سے میمانی کے معجزے جیسا کام لیا اور اس وقت جب غزل انتہائی بلندیوں سے بے نیازی اور لا پرواہی کی ٹھوکریں کھا کر تقریباً لڑھکتی ہوئی نیچے گم نامیوں کی طرف آرہی تھی تو ناصر کی غزل نے اس صنفِ سخن کا مضبوط سہارا بن کر اس کے زوال کو روکا اور پھر سے ایک بلند چوٹی پر اس کا پرچم لہرا دیا اور ظاہر ہے یہ چوٹی سر کرنے میں غزل کا بھرپور ساتھ اس وقت صرف ناصر نے دیا اور غزل کی گم ہوتی ہوتی سانسیں پھر بحال ہو گئیں اور پھر ناصر کی غزل نے اپنا سفر جاری رکھا اور سوچوں کی حسین "رات" کے ساتھ حالات کی دھوپ چھاؤں کو بھی برداشت کیا۔ جب صدے ملے تو کہا:

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی
 پھر اچانک ان کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے، اس لیے کہ انہیں احساس
 ہوا کہ ان کی ذات سے باہر بھی کچھ غلط صورتِ حال بننے والی ہے؛
 طنابِ خمیہ گل بھت نم ناصر کوئی آندھی افق سے آرہی ہے
 اور طوفان کو تو آنا تھا سو آیا۔ شاعر اُسے کہاں تک روکے رکھتا لیکن شاعر
 کے ارادوں نے طوفان کو شکست بھی تو دی اور وہ پلٹ گیا تب؛
 بچھڑ گئے تھے جو طوفان کی رات میں ناصر
 سنا ہے ان میں سے کچھ آٹے کنارے پر
 یوں وہ مقام بھی آیا جہاں؛

آئینہ لے کے پھر صبا آئی بھتی آنکھوں میں صبا بھر آئی
 یہ درست ہے کہ ناصر کی غزل اردو غزل کی روایت کو اپناتی ہے اور وہ غزل کے

شروع کے زمانے میں اس کے تغزل کے جو خواص متعین کئے گئے تھے ان سب کو بھلا نہیں دیتی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں لینا چاہیے کہ یہ غزل صرف پرانے زمانوں میں اتر گئی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ناصر تو کہتا ہے "میں جب تازہ غزل لکھتا ہوں تو پھر میر کو بھی سنا تا ہوں اور احمد شاق کو بھی"۔ اس کا مطلب تو واضح ہے ہی کہ ناصر میر کو پہچانتے ہیں اور پھر اپنی پہچان اپنے ہم عصر سے کراتے ہیں۔ یوں میر کا زمانہ ناصر اور احمد شاق کے زمانے سے آگیا ہے۔ ناصر نے اس کا ذکر تو نہیں کیا کہ ان کا زمانہ مستقبل کے کسی شاعر کے زمانے سے جا ملے گا، لیکن اس مصرع کا مطلب تو یہی نکلتا ہے

ع۔ ہر دور کی غزل میں میر انشاں ملے گا

غزل کا سانچہ اور بہت حسین سانچہ تو مدتوں پہلے سے بنا چلا آرہا ہے۔ یوں غزل کی ہیئت میں اس طرح کا اضافہ تو ممکن نہیں جس طرح نظم میں کہ کئی ہیئتیں بنی ہیں اور نہیں گی۔ لیکن غزل میں شاعر کی انفرادیت اور اس کے فن کا کمال اس کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے اور یہی اس شاعر کی غزل کی ہیئت ٹھہرتی ہے۔ ناصر کی غزل کی جن خصوصیات نے اہل ادب کو سب سے پہلے چونکا کے رکھ دیا ان میں ان کا اسلوب بھی شامل تھا۔ "ناصر کی لے، اس کی اشاریت، ایمانیت، رمزیت اس کے الفاظ کا صوتی آہنگ، اس کی زبان کی روانی کا ترنم اس کے منتشر اشعار کا تسلسل اور ان سب کے امتزاج سے پیدا ہونے والی ایک مجموعی فضا ناصر کی غزلوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس فضا نے اس کی ہیئت کو جدت سے ہم کنار کیا ہے۔ ناصر کی غزلوں میں یہ تجربات اردو غزل کی ہیئت

میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

تویوں اسلوب اور مواد کے لحاظ سے ناصر کی غزل نے اردو غزل کو حیاتِ نو دے دی، ”ناصر کاظمی کی شعری حیثیت کے تعین میں دو باتیں اہم ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے تاریخی اعتبار سے غزل کا پرچم اس وقت بلند کیا جب کہ سارے برصغیر میں اردو شاعری کا سب سے بڑا اظہار نظموں میں ہو رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کی اردو شاعری میں ناصر کاظمی کا نام فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے نام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔..... فیض اور ندیم کی طرح انھوں نے بھی ایک مدت تک اردو غزل کے پیش منظر پر قبضہ جماتے رکھا اور ملک کے گوشے گوشے میں ایسی غزلیں کہی جاتی رہیں جن میں ناصر کاظمی کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ اپنی رومانی طبیعت پر غزل جیسی کلاسیکی فارم کی تنظیم عائد کر کے ناصر نے ایسی مرصع اور اثر انگیز غزلیں کہی ہیں جن میں جذبہ کی آنچ اور فن کی پختگی دونوں کا بھرپور احساس ملتا ہے۔“

ناصر کی غزل نے صرف ایک خاص وقت میں ہی اردو غزل کو اپنے شعروں کی دولت نہ دی بلکہ ان کی زندگی کی آخری سانس تک یہ کان سونا دیتی رہی۔ اس تخلیقی فنکار کی تخلیقی قوتیں ہمیشہ جاگتی رہیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ زندہ تو رہے مگر حرکت و تلاطم سے بیگانہ رہے نہیں، ان میں جمود نہیں آیا بلکہ ان کے خیالات میں اور پھر اسی طرح ان کی غزل میں ارتقائی سفر جاری رہا۔ آخری دور میں تو ان کی غزل اور ان کی سوچ میں بہت وسعت آگئی تھی اور ناصر کو صرف فطرت سے ہی پیار نہ رہا تھا بلکہ انہیں متحرک زندگی سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ وہ ناصر جو کبھی کہتے تھے کہ ”بانسری کو

۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ”غزل اور مطالعہ غزل“ زار دو غزل میں ہیئت کے تجربے، ص ۶۱۲-۶۱۳

۲۔ سجاد باقر رضوی ”فنون“ جون ۶۲ء (ناصر کاظمی۔ ایک جائزہ) ص ۴۰۔

کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا تھا " وہی اب فن کے بارے میں یہ صحت مند سوچ رکھتے ہیں کہ "شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، چیزوں کو دیکھنے کا۔ ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔

..... اور یہ کہ Commitment میں نے اس طرح بعض بیانات کی صورت میں تو شاید بہت کم کیا ہو لیکن میرے کلام میں آپ کو — میرا خیال ہے کہ میں نے جو لفظ لکھا ہے، Commitment سمجھ کر لکھا ہے پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ کو آپ دیکھیں اور آپ میرے کلام کو دیکھیں تو ضرور اس میں وہ چیزیں دھڑکتی ہوئی نظر آئیں گی۔"

۱۔ ناصر کاظمی "تیا دور" شماره ۷، ۸۔ دنیا اسم ہس ۹۲۔

۲۔ ناصر کاظمی، نیوی انٹرویو

چوتھا باب

ناصر کی غزل کے اہم پہلو

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمانی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمانی ذرا کر کے تو دیکھو

تیسرے باب میں اردو غزل کے اجبار میں ناصر کی غزل کے مثبت کردار کو بیان کیا گیا تھا اور ناصر کی خوبوں پر ایک نظر ڈالی گئی تھی۔ اب اس باب میں ہم ناصر کی غزل کے فکری و فنی پہلوؤں کو جانچیں گے۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ غزل کیا ہے اور اس کا فن کیا ہے؟ اس سلسلے میں شاعروں اور نقادوں کی آراء دیکھے جیتے ہیں۔

حقیقی معنوں میں غزل کی شاعری وہ ہے جس سے ہمیں درد بھری اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دے..... ہم درد بھری باتیں کیوں سننا چاہتے ہیں، ہم درد بھرے اشعار کو کیوں پیار کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر درد سچا اور پکا ہے اور اس میں خلوص ہے، معصومیت ہے، نرمی ہے اور نرم ہے تو ایسا درد ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ گھرے سے گہرا اطمینان اور توانائی بخشتا ہے اور حیات اور کائنات کے لیے ہمارے اندر محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے..... غزل زمان و مکان میں بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے واقعات کا ست یا جوہر نکال لیتی ہے اور ہر شخص کی آپ بیتی کو جگ بیتی

بنادیتی ہے۔“

”..... غزل کا بنیادی یا لغوی مفہوم جو بھی ہو ایک صنفِ شاعری کی حیثیت سے مضامین اور اسالیب دونوں میں اس سے زیادہ وسعت اور تنوع کا امکان کسی دوسری صنف میں نہیں۔“

”..... اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل میں اگرچہ تنوع اور ہمہ گیری ہے لیکن اس کے باوجود ایک یکسانی اور یک رنگی بھی ہے۔ یہ صورتِ حال سوائے غزل کی صنف کے کسی دوسری صنفِ سخن میں نہیں مل سکتی اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ غزل کا دائرہ محدود ہے۔ اس میں وضاحت اور تفصیل تحلیل اور تجزیے کی گنجائش نہیں۔ اس میں بہت کم کہہ کر بہت کچھ مراد لی جاتی ہے۔ اس میں کسی چیز کو کھول کر بیان نہیں کیا جاتا۔ اس میں جو الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں ان کی معنویت صرف اصلیت اور حقیقت تک محدود نہیں رہتی۔ ان کا ایک مجازی مطلب بھی ہوتا ہے۔ ان میں ایک چھپی ہوئی معنویت بھی ہوتی ہے۔ غزل میں توضیح و تشریح کی بجائے اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔“

”..... وہ کون سی نئی ضروریات تھیں، جن کے پیش نظر صنفِ غزل ایجاد کرنا پڑی؟ وہ ضروریات عورتوں کے حُسن کی بجائے زندگی کی ترجمانی و تنقید سے متعلق تھیں..... اردو غزل کی ابتداء اور بے مثال ترقی بھی اسی عہد (اور رنگِ زیب سے غالب تک کے زمانے) میں ہوئی۔ اس ڈیڑھ صدی کے دوران جن ہستیوں نے

۱۔ فراق گورکھپوری ”تہکار“ شمارہ ۳-۲۰، غزل کیا ہے؟ ص ۱۳۰

۲۔ جنوں گورکھپوری ”اسنافِ شاعری نمبر ۱۱، نامہ ۶۶، شعر اور غزل ص ۲۰۰

۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ”غزل اور مطالعہ غزل“ (غزل اور تغزل) ص ۱۲۹۔

غزل کو غزل بنایا وہ تصوف و حکمت اور جرأت و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل محض عورتوں کے حُسن کی بات نہیں بلکہ بادہ و ساغر کے پیرائے میں شاہدہ حق کی گفتگو ہے۔" لے

غزل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ کلیم الدین احمد کی ترشش اور تلخ رائے سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی نے بھی کچھ اعتراضات کئے تھے۔ حالی کو شکوہ اس بات پر تھا کہ بیشتر شاعر غزل میں ذاتی تجربے کا بیان نہیں کرتے۔ بلکہ ردیف اور قافیے کے سہارے شعر موزوں کر دیتے ہیں۔ اس لیے حالی نے کہا "ہمارے ہاں قافیے کے پیچھے ایک ردیف کا دم چھلا لگایا گیا ہے۔ اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے، لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیے کو.... پس جب کہ ردیف اور قافیے کی گھاٹی خود دشوار گزار ہو تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گزر بنانا انہیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ ستر کا نہیں رکھتے اور شاعروں کا مال محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس۔" لے

ناصر کاظمی بھی انہی لوگوں، یعنی غزل کو قافیہ پیمائی سمجھنے والے لوگوں کے مخالف ہیں۔ انہوں نے محض قافیہ پیمائی نہیں کی بلکہ بہت اچھی غزل کہی۔ ان کے دوست شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے کہ ناصر کی غزل یوں ہے جیسے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر ہر طرف بادل گھبرے ہوئے ہوں، بجلی چمک رہی ہو، یوں وقفے وقفے کے بعد کہیں کہیں سے کوئی منظر دکھائی دے جاتا ہے۔ غزل گو شعور و

وانش کی بندوبستوں سے انسان کی اس طوفان زدہ زندگی کے دکھ سکھ کے مختلف پہلو دیکھتا ہے اور غزل میں اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ یوں منظر مختلف، واقعات مختلف، لیکن ایک تسلسل ضرور قائم رہتا ہے۔ ان مناظر کو مربوط کرنا تخیل کا کام ہے۔ اصل میں غزل کوئی کرنا ہو تو ایک خاص بندی پر کھڑا ہونا ہی پڑتا ہے تاکہ دور تک اور گہرائی تک دیکھا جاسکے۔ شیخ صلاح الدین صاحب کا مزید ارشاد ہے کہ میں ناصر سے کہتا تھا کہ تجھے پڑھنا تو مصیبت ہے! اس لیے کہ ناصر کی ایک غزل پڑھتا ہوں تو اور کچھ نہیں پڑھتا۔ سب اہم بات جو گفتگو کے دوران میں شیخ صاحب نے بتائی وہ یہ ہے کہ ناصر شاعری میں الہام کے قائل نہیں تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ صرف حصول علم سے شاعر بنا جاسکتا ہے۔ محض علم حاصل کر لینے سے اگر کوئی شخص فن کار بن سکتا تو

بھلے مانس تنقید نگاروں کو کون پوچھتا؟ فن کار اپنے علم کو براہ راست نہیں اگلتا بلکہ اسے ہضم کرتا ہے اور تخلیقی لمحوں کے لیے بروقت تیار رہتا ہے۔ علم حاصل کرنے اور تحقیق

کام کرنے کے درمیان ایک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

علم اور تجربے کے سفر کے بعد ذہن تھک جاتا ہے اس تھکن میں سرور کے ساتھ ساتھ ایک بے زاری کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس وقفے میں فن کار اپنے علم اور تجربے کو اپنے تصور کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن سونا بناتا ہے۔

شیخ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ناصر الفاظ چن کر اور شعر منتخب کر کے غزل لیتے۔ جب تک اچھی طرہ تسلی نہ ہو جاتی شعر نہ کہتے۔ پورا اطمینان ہو جاتا تو پھر شاعری کرتے اور اس کے بعد بھی کاٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ مسلسل غور کئے جانا ان کا معمول تھا اور خاص اہتمام کرنا ان کی عادت تھی۔ چاہے شعر ہو، کھانے کی بات ہو، باں کا معاملہ ہو، لوگوں سے ملاقات کرنا ہو، رات جاگنا ہو یا شعر کہنے ہوں، وہ یہ سب

کچھ خاص اہتمام سے کرتے تھے۔

ناصر کی واوٹی غزل کی صحیح پہچان کے لیے ہمیں ناصر کی غزل کے اہم نگری اور فنی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔

اچھے غزل گو کا واضح نظریہ جیتا نہ ہو تو وہ غزل گو ہی نہیں کیونکہ نظریہ جیتا ہوگا تو تبھی کوئی وزنی بات کی جاسکتی ہے۔ ناصر چاہتے ہیں کہ یہ جو انسانی زندگی ہے اس کے سبھی ڈکھ ختم ہو جائیں۔ جب شاعر اپنے دکھوں کا اظہار اس طرح کرے کہ سامع اور قاری کے دل میں بھی طمیس اٹھے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اصل میں یہ احساس دلا رہا ہے کہ دیکھو میں کتنا دکھی ہوں یا یہ کہ ہم سب کتنے دکھی ہیں۔ پھر چاہے وہ یہ کہے یا نہ کہے کہ ان دکھوں کو کس طرح اور کیونکر دور کیا جاسکتا ہے، وہ چاہتا تو یہی ہے کہ اس دنیا میں سکھ ہی سکھ پھیل جائیں۔ انسان کی سبھی نیک خواہشیں پوری ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ناصر یہ کیوں کہتے.....

دنیا کتنی نئی ہے مگر پھر مجھے یہ اتنی پرانی کیوں نظر آتی ہے؟ کون سی شے گم ہو گئی ہے کہ ہم نے نئی دنیا بنا کر بھی دیکھ لی اور وہ فوراً کے فوراً پرانی نظر آنے لگی؟

حال کا حال بے حال ہے نئے سازد سامان بہت ہیں مگر ان میں کوئی ترتیب نظر نہیں آتی۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہے۔ کہیں سازد سامان ہی سازد سامان ہے کہیں بائکل بے سرو سامانی ہے! لے

اور پھر وہ یہ مشورہ کیوں دیتا ہے:

سازد ہستی کی صدا غور سے سُن کیوں ہے یہ شورِ پانغور سے سُن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے جاگ اور شورِ دروغور سے سُن

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک

کوئی دن اور سہ لے ستم صبر کر صبر کر

ڈاکٹر محمد حسن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں "..... ناصر کی غزلوں کی

خصوصیت تنہائی اور خود فراموشی کے احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خود فراموشی

محض نجی اور ذاتی نہیں ہے بلکہ اس احساس نے قدرتی مناظر، آسمان کے چاند، زمین

کے اونچے اونچے پٹیروں اور آباد شہروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ یہ

عالم تنہائی، درد کی ایک باریک سی چھوٹ اور ملجلی چاندنی، یہی ناصر کی دنیا ہے۔

ناصر اپنی دنیا کا قیدی نہیں۔ اس کا فرمانروا مغنی ہے۔ مگر ایک ایسا فرمانروا جو

مطلق العنان ہے نہ مکمل طور پر خود مختار، بلکہ اس کی آواز اس کی دنیا کی ایک

ایک پتی، ایک ایک پھول سے چھین کر آتی ہے۔ اس کی آرزو میں بڑی چھوٹی سی

ہیں۔ دوستوں کی محفلیں، قہقہے، دیارِ رنگ و بو میں راتیں، ہم سفریوں کے ساتھ

دقت گزارنے کا ارمان، خلوص اور پیار کے دہلول — مگر غور کیجئے تو اجتماعی

زندگی کو سنوارنے کے منصوبے، انسان کو چاند تکسے جانے اور تاروں پر کند

ڈالنے کے حوصلے بھی انہی چند چھوٹے چھوٹے خوابوں کی تعبیریں ہیں کہ انسان ہر

مک، ہر زمانے کا انسان، خوش رہنا چاہتا ہے، ہنسنا کھیننا چاہتا ہے۔" لے

ناصر بہت سی خواہشیں دل میں ہیں بے قرار

لیکن کہاں سے لاؤں وہ بے فکر زندگی

آخر ناصر یہ کیوں بتا رہا ہے کہ اُسے بے فکر زندگی میسر نہیں۔ اس لیے ناکہ

وہ ایسی زندگی کا خواہشمند ہے جو اُسے میسر نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ،

مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے سے خیال بچھے بچھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے
ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدے ہم سے پوچھے کوئی افسانہ گل
وہ درحقیقت انسانی زندگی کے تنوع کے شاعر ہیں اور انہوں نے زندگی
کے تنوع پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ زمانے کے حالات، گرد و پیش کے
واقعات اور عصری میلانات کی ترجمانی اور عکاسی تو ان کی غزل کا ایک پہلو ہے۔
اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے ان گنت پہلوؤں کو بھی انہوں نے غزل میں داخل
کیا ہے۔ مثلاً ناسازگار سماجی ماحول اور ایک غلط نظامِ اقدار میں زندگی جن حالات
سے دوچار ہوتی ہے اس کی تفصیل بھی انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کی ہے۔
اس نظام نے زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ان کی نظریں گھر گھر
سوگ کو پھیلا ہوا دیکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ

دہلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

سارے سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار

راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگرہی کے لوگ

تھے تھے سے بیٹھے ہیں راگی اور سنکار

بھور بھٹے اب ان گلیوں میں کون سناٹے جوڑ ملے

اور ناسر جب سہمی سہمی نظریں لیے یہ خبر دیتا ہے کہ

خیر ہو شہرِ شبِ بنم و گل کی کوئی پھرتا ہے آس پاس ادا اس

تویہ "کوئی" کون ہے اور "کوئی" ناصر کی غزل میں ایک خاص کردار ہے۔

چونکہ ناصر ایک حقیقت پسند رومانوی ہیں اس لیے ان کی دادی غزل میں حقیقت

بھی نقاب اوڑھے دکھائی دیتی ہے اس لیے تو ناصر بھی اس کی صحیح شناخت نہیں
 کر سکتے۔ لیکن ان کو اپنی شاعرانہ چھٹی حس انہیں خبردار کئے دیتی ہے کہ 'کوئی'
 ہے۔ کچھ ہونے والا ہے۔ ناصر نے اپنے ذمے یہ کام لیا کہ وہ آنے والے خطرس
 سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ البتہ انہوں نے ان خطروں کو دور کرنے کے حل اور
 علاج نہیں بتائے۔ لیکن ایک حقیقت پسند رومانوی نے یہ توقع تو پوری کر ہی دی
 کہ وہ دھند سے پرے چلتے پھرتے ہیولوں کو دیکھ سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے۔

سہمے سہمے رات اہل چین تھا کوئی آدمی درختوں میں

کیا لگے آنکھ کہ پھر دل میں سما یا کوئی

رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایا کوئی

یہ تو درست ہے کہ غزل کی نسبت نظم معاشرتی شعور میں بڑے پیمانے پر اضافہ
 کر سکتی ہے لیکن غزل بھی اس سے عاری نہیں کی جا سکتی۔ دراصل یہ شعور غزل کی ایما
 اور اشاریت میں چھپا ہوتا ہے۔ وہاں ایک خاص تہذیب اور ایک خاص معاشرے
 کی تصویریں مٹی ہوتی ہیں۔ یہی رمزیت، ایمایت اور اختصار اثر پذیر کی نظم کی تفصیل
 سے زیادہ گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔ یہ جو ناصر ماضی کی طرف پٹ پٹ جاتے
 ہیں، قدم آگے اٹھ رہے ہیں لیکن پیچھے مڑ کر بھی دیکھ رہے ہیں تو کیوں؟ وجہ
 یہ ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ماضی کی روایت بھی ان کے ساتھ آرہی ہے کہ نہیں۔
 ماضی جو انہیں بے حد عزیز ہے، اس ماضی کی تلاش میں وہ تیرتا گئے۔ روایت کے
 معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔ یعنی
 روایت وہ روح ہے جو کسی عصرِ رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے
 زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک پس منظر لازمی ہے...

زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے تارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے.....

” انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی اہمیت کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ میر کا ”شب چراغ“ تھوڑی دُور تک رستہ دکھا سکتا ہے۔ منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔“

دراصل ناصر نے میر کی روایت کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب ان کے یہاں ان کی اپنی غزل آگی تو اس میں یہ ”میریت“ اس طرح گھل گئی تھی کہ علیحدہ سے پہچانی نہ جاتی تھی۔ میر، ناصر کے لیے ایک تحریک بن گئے۔ انہیں نئے تخلیقی تجربوں کے اظہار کے لیے اگے والے بن گئے۔ میر سے مماثلت ناصر کی غزل کو طاقت دینے والا ایک نسخہ ہے۔ یوں جب ناصر یہ کہتے ہیں کہ:

بل ہی جائے گا رفتگاں کا سرخ اور کچھ دن پھر واداس اُداس
تو ناصر کے ہاں یہ اُداسی بھی تخلیقی قوت بن گئی ہے۔ ناصر کے یہاں ان کی ذاتی اُداسی کی جو گھٹا اُداسی تھی وہ ساری کائنات پر پھیل گئی۔ ناصر کی اُداسی میں سارا جہاں ہمٹ آیا۔ ناصر کاظمی کے کلام میں ایک قسم کی زیر لب افسردگی ملتی ہے۔

اس افسردگی کو نامرادی اور مرضیانہ داخلیت سے تعبیر کرنا مناسب نہیں وہ اپنی ذات کے محدود گھر وندے میں نہیں ہیں۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ ان کی فراریت "زرگسیت" سے دور ہے۔ وہ ناکسوس کی طرح حوض میں اپنے عکس کو دیکھ کر صرف اپنی ذات سے دلچسپی لینے نہیں لگتے یا اپنی ذات سے محبت کر کے تمام دوسرے عناصر سے دامن نہیں چھڑا لیتے۔" لے

ناصر کے ہاں اُداسی کا ایک خاص تصور ہے۔ انہیں اُداسی قنوطیت پسند نہیں بناتی، بلکہ انہیں حقیقت کو سمجھنے کا شعور بخشتی ہے۔ یہ اُداسی انہیں اپنی ذات کی گہرائیوں کو بھی پہچاننے میں مدد دیتی ہے،

تو جو اتنا اُداس ہے ناصر تجھے کیا ہو گیا، بتا تو کسی
چُپ چُپ کیوں رہتے ہو ناصر یہ کیا روگ لگا رکھا ہے
بستی والوں سے چھپ کر رو لیتے ہیں کھلی رات

ہٹی مٹی سی امیدیں، ٹھکے ٹھکے سے خیال

بچھے بچھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے

بیٹھے بیٹھے برس پڑیں آنکھیں کرگئی پھر کس کی آس اُداس

کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے لیے پھرتی ہے کوئی باس اُداس

پھر یہی اُداسی پھیل کر معاشرے کی اُداسی بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر

طرف پھیلے دکھ دیکھ رہے ہیں اور انہیں فکر ہے کہ:

خیر ہو شہر شبنم و گل کی کوئی پھرتا ہے آس پاس اُداس

ہم یہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے ہم سے پوچھے کوئی افسانہ گل

دل تو میرا ادا اس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
دراصل بات یہ ہے کہ شاعر سارے معاشرے، پوری انسانیت کا نائندہ
ہوتا ہے اس لیے اس کا فرض بلکہ حق ہے کہ وہ اپنی ذات سے آگے پھیل کر ان کے
مسکھ اور دکھ میں شامل ہو اور اگر اُسے اس قسم کا کوئی احساس ہو کہ

شہر در شہر گھر جلائے گئے یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طپور اس گلستان کی ہوا میں زہر ہے
(ربرگ نے)

چند گھرالوں نے بلِ جُبل کر کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
کارواں سست اور امیر خاموش کیسے گزرے گا یہ یہ سفر خاموش

(دیوان)

پتھر کا وہ شہر بھی کیا بہت شہر کے نیچے شہر بھٹا
لوگ بھی سارے پتھر کے تھے رنگ ان کا پتھر جیسا تھا

(پہلی بارش)

تو ان کا اظہار اپنے کلام میں کر دینا چاہیے۔ ناصر نے ایسا ہی کیا ہے۔ بس یہ ہے
کہ ان کے مزاج کی رومانویت انہیں ان مسائل کے حل سوچنے کی طرف مائل نہیں
کیا۔ یوں بھی اعلیٰ شاعری (بلکہ ہر اعلیٰ فن پارے) کا مقصد کسی چیز کی پہچان کر دانا
ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے ایسے عظیم شاعر بھی ہو گزرے ہیں جو پہلے
خوب سوچ بچار کرتے ہیں پھر وہ جنت جو ہر شاعر نے اپنے اندر بسا رکھی ہوتی ہے
اس کے نظامِ اقدار کو متعین کرتے ہیں اور پھر ان کا اظہار اس خوبصورتی سے اپنی
شاعری میں کرتے ہیں کہ فن پارے کا دقتار مجروح نہیں ہوتا۔ ناصر بھی ایک جنت کی
تلاش میں ہیں۔

ایک انوکھی بستی دھیان میں بستی ہے اس بستی کے باسی مجھے بلاتے ہیں
 وہ اس جنت کے بننے کی راہ میں جو جو رکاوٹیں ہیں ان کی طرف دیکھنے اور
 غور کرنے کی تلقین ضرور کرتے ہیں لیکن یہ تلقین، شاعری میں ڈھل کر آتی ہے۔
 یوں وہ اچھی منزلوں کی طرف جانے والی راہوں کی طرف بلوغ اشارے کرتے ہیں،
 چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن
 کبھی فرصت ہو تو اے صبح جمال شب گزیدوں کی دعا غور سے سن

دل سکو تو بدل دو یہ باغیاں ورنہ یہ باغ سایہ سرد سن کو ترسے گا
 ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن زمین پانی کو اور سورج کرن کو ترسے گا
 ناسر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو

کچھ ہوتا ہے جب خلق خدا کچھ کہتی ہے
 خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
 تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں
 یہ بجا کہ آج اندھیرے وزارت بدلنے کی دیر ہے
 جو خزاں کے خوف سے خشک ہوئی شاخ لائے گی برگ بر

یوں ناصر نے ”برگ بنے“ سے جو اداسی اور تنہائی کا طویل سفر شروع کیا
 تھا، وہ اُمید اور رجائیت میں ڈھل گیا اور اداسیاں اور تنہائیاں ناصر کو نئی
 طاقت دے کر پھر سے ایک نئے سفر کے لیے تیار کر گئیں،
 تیرے قدموں سے جاگیں گے اجرے دلوں کے فتن

پاشکتہ غزال صبر کو صبر کو
 یہ محلاست شاہی تباہی کے ہیں منتظر
 گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کو صبر کو

پہلے کھل جائے دل کا کنول پھر نکھیں گے غزل
کوئی دم اسے صبر یہ قلم صبر کو صبر کو
اور بالآخر:

گہری نیند سے جاگو ناصر وہ دیکھو سورج نکلا ہے

”دشمن معاشرے میں شاعر کا کام بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ معاشرے سے اس کی جنگ
بڑے تدبیر کی جنگ ہوتی ہے۔ کسی ایک قدر کا ٹوٹنا۔ اس کی سلطنت پر پورسش ہوتی
ہے۔ شاعر کبھی کبھی حالات کے جبر کے تحت ہتھیار بھی ڈالنا محسوس ہوتا ہے۔“

اب تو غوش ہو جائیں اربابِ ہوس جیسے وہ تھے ہم بھی دیسے ہو گئے
ہم بھلا چپ رہنے والے تھے کہیں ہاں مگر حالات ایسے ہو گئے
لیکن جب شاعر کو موقع ملتا ہے تو وہ شب خون مارنے سے باز نہیں آتا:
سرِ مقل بھی صدا دی ہم نے دل کی آواز سنا دی ہم نے
پہلے اک دوزخِ در توڑا تھا اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے

ہماری اردو غزل کی روح رواں، محبت کا جذبہ ہے اور ناصر کاظمی
کی غزل کا خاص موضوع عشق ہی ہے۔ مگر یہ عشق سطحی اور جامد نہیں ہے۔ ان کے
عشق کی وسعت میں زندگی کی پہنائیاں موجود ہیں۔ دراصل ناصر کے عشقیہ مضامین کی
نو عبیت دوسرے غزل گو شعراء کے پیش کئے ہوئے مضامین سے مختلف ہے۔
ان مضامین میں نئی نسل کا وہ مزاج ہے جو محبوب کی پرستش نہیں کرتا۔ جس کو اس
کے نام سے کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے۔ ناصر کو ایک محبوب ہستی ملی تو لکھی:

سہ ڈاکٹر سلام منڈھلوی ”خیابان“ دسمبر ۶۶ء (اردو غزل)

سہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ”جدید شاعری“ دنا ناصر کاظمی اور برگ نے ۶۹۱

لب چو چھاؤں میں درختوں کی وہ لاقات تھی عجب کوئی

پہلی بارش، میں اور تو زرد پہاڑوں کا دامن

ہکی ہوئی سانس، زم گفتار ہر ایک روش پہ گل کھلانے
راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں آنچل میں جیسے منہ چھپانے

رنگ کھلے صحرا کی دھوپ زلف گھنے جنگل کی رات

یہ سانچہ بھی محبت میں بار بار گزرا

کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

لیکن پھر:

تو ہی بتا کہ تری خامشی کو کیا سمجھوں

تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں

اور ہوا یوں کہ

ترے دصال کی اُمید اشک بن کے بہہ گئی

خوشی کا چاند شام ہی سے جھللا کے رہ گیا

تو آنکھوں سے ادھبل ہوتا جاتا ہے

دور کھڑے ہم خالی ہاتھ ہلاتے ہیں

شودر پاپے خانہ دل میں کوئی دیواری گری ہے ابھی

پھر محبوب کی صرف یاد باقی رہ گئی:

ہم جس پیر کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے
اب اس پیر کے پتے چھڑتے جاتے ہیں
وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منہ زلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکاٹے گزر گیا وہ

یا پھر خیال :

خیالِ حُسن میں کتنا بہار پرور ہے
شبِ خزاں کی خشک چاندنی کا نظارہ
ترے خیال سے لوٹے اٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چسلیں
تب ناصر تڑپ اٹھتے :

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سُن گئے ہیں دل کے ویرانے

اور جب محبوب نہ آیا تو Prince ناصر اپنی Princess لے

حمیرا سے ناراض ہو گیا۔ "لو بھلا تمہاری میسرے کیے کتنی اہمیت تم تو مجھے یاد
بھی نہیں آتیں" — وہی رومانوی شعرا کی حقیقت سے فرار کی کوشش۔ "بھلا بھول"

جاؤں ، بھول جاؤں ، کئی تکرار کرنے سے بھی کوئی کسی کو بھولا ہے ، بلکہ یوں تو یاد میں اور شدت آجاتی ہے ۔ ناصر کہنے کو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ،
 یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
 جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
 ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
 برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
 لیکن اس کا کیا حل ہو کہ :

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
 محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی
 او پھلی رُت کے ساتھی اب کے برس میں تنہا ہوں
 دل میں تیری یادوں نے کیسے کیسے رنگ بھرے

سینے میں اُمنگوں کا وہی شور ہے اب تک
 وہ شوخی یک جنبش لب یاد رہے گی

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
 بگلا رہی ہے ابھی تک وہ دلنشین آواز

کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے لیے پھرتی ہے کوئی باس اُداس
 وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا جو پھلی رات سے یاد آرہا ہے
 ناصر کی یاد صرف محبت کی یاد نہیں ، بلکہ ناصر کو اور بھی بہت کچھ یاد ہے اور
 بھی کئی ایسی یادیں ہیں اور انہیں بے چین کر دیتی ہے ۔ ایک اُن کے بچپن کے حسین
 زمانوں کی یاد ، بچپن میں بھی وہی کھلا ہوا بنا ہے اپنا میت
 جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری بیر

پھر اس مٹ چکی اور مٹی ہوئی تہذیب کی یاد ہے جس میں ناصر پہلے بڑھے۔
اب اس غزل میں دیکھتے ناصر جو خود ایک دریا ہے ایک بھولی بسری کہانی سنا رہا ہے:

سُناتا ہے کوئی بھولی کہانی !
مکتے بیٹھے دریاؤں کا پانی
یہاں جگل تھے آبادی سے پہلے
سُناتے ہیں نے لوگوں کی زبانی
یہاں اک شہر تھا شہر نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی
میں وہ دل ہوں دبستانِ الم کا!
چسے روئے کی صدیوں شادمانی
تصور نے اسے دیکھا ہے اکثر
خرد کستی ہے جس کو لامکانی
خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بنا لیتا ہوں اک دنیا سہانی
بتا اے ظلمتِ محرابے امکان
کہاں ہوگا مرے خوابوں کا ثانی
کرن پر یاں اُترتی ہیں کہاں سے
کہاں جاتے ہیں رستے کھکٹانی!
پہاڑوں سے چلی پسہ کوئی آندھی
اُڑے جاتے ہیں اوراقِ خزانہ

نئی دنیا کے سنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی!

ایک انوکھی بستی دھیان میں بستی ہے
اس بستی کے باسی مجھے بلاتے ہیں

وہ لوگ یاد آتے ہیں جو لاہور آنے سے پہلے انہاںے میں چھوڑ آئے۔ وہ بھی
جنہیں ناصر "رفنگاں" کہتے ہیں اور وہ بھی جو تہذیب و اقدار کی ایسی نشانیاں تھیں جو
اب ٹٹتی جا رہی ہیں ا

جب بھی نئے سفر پر جاتا ہوں ناصر
پچھلے سفر کے ساکتی دھیان میں آتے ہیں

ساری رات جگاتی ہے بیٹے لمحوں کی جھانجن

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا جو پچھلی رات سے یاد آرہا ہے

اُس کی خوشبو دکھاتی ہے کیا کیسا دشتِ غربت میں یادِ وطن پھول ہے

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ لوگ تھے رفنگاں میں کیا کیا کچھ

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریکِ مس۔ نزل جنوں
بہت ہوا تو رفنگاں کا دھیان آکے رہ گیا

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑکے جس سے ہوئی شہرِ شہرِ جوانی

آکے منزل پہ آنکھ بھرا آئی سب مزہ رفتگان نے چھین لیا

دل دیراں میں دستوں کی یاد جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے

رات بھر چاند کے ہمراہ پھرتے تھے

ناصر کے ہاں خاص کیفیتوں کے اشعار ملتے ہیں۔ یہ ناصر کی غزل کی انفرادیت بھی ہے جن سے بعد کے شعراء نے بہت اثر لیا۔ ناصر کاظمی نے فراق سے کیفیت نمائی کا انداز لے کر اسے جدید (جدید تر نہیں) غزل کے ایک نئے دور کا نعرہ جھانڈنا دیا..... ناصر نے غزل کو کیفیتوں کی دریافت و اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیونکہ انہیں اس کا احساس ہے کہ اب تک غزل سے جذبہ و خیال کی ترجمانی کا کام تو لیا گیا ہے، لیکن رنگ، نضا، احساس و کیفیت کے بہت سے نقوش روشن نہیں ہونے پائے ہیں، خود احساس و جذبہ کی بعض ایسی صورتیں ہیں جن کا اظہار کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایسی صورتیں اگر اشعار کے ذریعے پڑھنے والے پر وہی کیفیت طاری کر دیں جو شاعر پر گزری تھی تو یہ ہوگی کیفیتوں کی شاعری۔ ناصر کے ہاں کیفیت کئی اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ خاموش مگر بولتی ہوئی، بہت کچھ کہتی ہوئی کیفیتیں؛

ریل کی گہری سیٹی سن کر رات کا جنگل گونجا ہوگا

شہر کے خالی اسٹیشن پر کوئی مسافر اُترا ہوگا

لے ڈاکٹر حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹، رازدو کے زاویے، ص ۱۱۔

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی سردا کچھ کہتی ہے

سو گئے لوگ اُس جوہلی کے ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تو ہے اولد بے خواب دریچے میں ہوں اور سنان گلی ہے

گنج میں بیٹھے ہیں چپ چاپ طیو بون پگھلے گی تو پر کھولیں گے
مندرجہ ذیل غزل قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے سادگی
کائنات اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے، سانس تھامے بیٹھی ہے۔ منظر ہے کسی تبدیلی کی۔
ایسے انقلاب کی جو ہر اچھی شے کے حق میں ہو۔ گویا یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا
پس منظر ہو۔

اُس گلی کے گزرنے والوں کو!
تکتے رہتے ہیں بام و در خاموش

یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش
شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفان ہے پردہ در خاموش
ابھی وہ قافلے نہیں آئے

ابھی بیٹھیں نہ ہم سفر خاموش

اب یہ اشعار دیکھیے :

میں ہوں رات کا ایک بچا ہے خالی رستہ بول رہا ہے

آج تو یوں خاموش ہے دنیا جیسے کچھ ہونے والا ہے

سہمے سہمے رات اہل چین تھا کوئی آدمی درختوں میں

چمکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر

کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی ادا سی ہے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی ترا دیا جلانے والے کی بھئی

کیسے سنان ہیں آسماں چپ کھڑے ہیں مکاں

ہے فضا اجنبی اجنبی ، سو رہو سو رہو

چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں

سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو

منہ اندھیرے ہی ناصر کے ڈھونڈنے چل دیے

دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو

جنگل جاگے ، ہوا چلی چونک پڑی ہرنوں کی ڈار

کئی شعر ایسے ہیں جن میں تجسس بھرا ہوتا ہے اور باتوں میں Suspense پیدا

کئے رکھنا ناصر کو پسند بھی تھا۔ یہ ان کی عادت بن گئی تھی۔ پھر ان کو اس میں کمال بھی حاصل تھا:

خیبر ہو شہر شبنم و گل کی کوئی پھرتا ہے اُس پاس اُداس
آج کی رات نہ سونا بارو آج ہم ساتواں درکھولیں گے
چینیستی ہیں ڈراؤنی راتیں چاند نکلا ہے آسماں سے دور

”رات“ ناصر کو بے حد عزیز ہے۔ ناصر کی دلی آرزو تو یہ تھی کہ دنوں کو سو کر اور راتوں کو جاگ کر زندگی گزارے۔ اُس کے لیے دن ہنگاموں اور بے معنی مشروفت کی چیز تھا اور رات زندگی کی معنویت اور تخلیق کا منبع راتوں کو دستوں کی محفل میں لپچھے گفتگو کرنا اور شکرگوں پر ہلنا اُس کا دلچسپ مشغلہ تھا..... اُس کی پوری زندگی کے سفر کا حاصل ہجر کی راتوں کا طویل سلسلہ، اُداسیوں کی محبت تصویریں، سفر کی گرا اور زندگی کی بے حاصلی تھی۔ خود ناصر نے کہا:

”اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ رات، اندھیری رات نہیں یادہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی غلاست ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو، سمندر میں موج ہوتا ہے رات کو، خوشبو میں رات کو جنم لیتی ہیں حتیٰ کہ فخر تک فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوتی۔ ایک یہ بات دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جوان راتوں کا ذکر کیا تو اب بھی راتیں جاگتی ہیں لیکن شہر سویا جا ہے۔“

شہر اس لیے سویا ہے کہ ناصر جیسے شاعر اسے جگانے کے لیے نہیں آرہے اور

یوں شہر کائنات بن جاتا ہے اور جاگنے والے صرف باشعور اور رکھوالے لوگ رہ جاتے ہیں۔

دانا کی نگرانی میں ناصر میں جاگوں یاد آتا جاگے

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

ساری بستی سو گئی ناصر تو اب تک کیوں جاگ رہا ہے

”رات جتنی بھیگتی اُس کی آنکھوں میں چمک اور اُس کی آواز میں رُحی پیدا ہوتی جاتی۔ اُس کا تخیل بہک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ میٹر کے شعر پڑھتے پڑھتے اُسے سُور داس کا کوئی درد یاد آ جاتا۔ کبھی سُور داس کبھی کبیر۔ زنا ناصر کو میرا بانی کے بھمن بھی تو بے حد پسند تھے۔ ان کے نزدیک میرا بانی اُداسی کی بہن ہے (مگر جب تیرا ہونے لگتا تو ناصر چپ ہو جاتا۔ چپ اور اُداس اور اُسے نیند آنے لگتی۔ اُسے دماغ ناصر کے ہاں ایک شاعر ہی سوال نہیں کرتا بلکہ یہ کائنات، اس کے مظاہر، فطرت کی بھی چیزیں کچھ کہتی ہوتی محسوس ہو رہی ہیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کی دشمنی نے اپنے ذمہ نہیں لی۔ یہ ذمہ داری اس نے پڑھنے والے کی سمجھ کے سپرد کر دی ہے۔“

یہ ٹسٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں

یہ نامشی آواز نمسا کچھ کہتی ہیں

رات بھر ہم نہ سو سکے ناصر پردہ خامشی میں کیا کچھ بھتا

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

بجھی بجھی سی ہے کیوں چپاند کی ضیا ناصر

کہاں چلی ہے یہ کاسہ اٹھائے شامِ فراق

ناصر نے ایک بار کہا تھا کہ فطرت تو اسی طرح ہے، تارے نکلتے ہیں، ٹوٹتے ہیں۔ آنکھیں
چھپکاتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے، ناپچتا ہے اور پھر اوجھل ہو جاتا ہے۔ درخت
اسی طرح ملتے اجڑتے رہتے ہیں لیکن موسم بدل گئے ہیں، سبزہ لہکتا ہے لیکن شہر کے دھوئیں میں
جھلس جاتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں لیکن انہیں کوئی نہیں دیکھتا۔ دل اب بھی دھڑکتے ہیں لیکن آہنی
مشینوں کے شور میں ان کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ جبکہ ناصر یہ سب کچھ دیکھ بھی رہے ہیں اور سن بھی
رہے ہیں۔ ان کا بھی مشہور مصور لیونارڈو ڈاؤنچی کی طرح یہی خیال معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری
خوبصورتی یہ سارا حسن فنا ہو جائے گا، اسے آرٹ میں محفوظ کر لو، ناصر کی رات کے بارے میں
شاعری ایسی ہے کہ اسے رات میں پڑھو تو پراسرار کیفیت اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اُداسی کی
ایک فضا ہے لیکن یہ اُداسی ایسی نہیں ہے جو چلتے قدموں کو تھام لے، جی چاہتا ہے اس اُداسی
کے خوبصورت غار میں اتر کر نئی دنیا دیکھیں اور خاموش پُرسکون فضا میں کچھ سوچیں اور سوچتے
چلے جائیں۔ یہاں تنہائی بھی ہے لیکن خاموش سا تنہائی بھی ہے۔ چاند، تارے اور کہکشاں سڑکیں
اور روشنیاں :

گلشنِ منکر کی منہ بند کلی شبِ بہتاب میں وا ہوتی ہے
شب کی تنہائیوں میں پچھلے پہر چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے

رین اندھیری ہے اور کنارادور چاند نکلے تو پارا تر حبا میں

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے آگ سی لگ گئی درختوں میں

نیند آتی نہیں تو صبح تک گردِ بہتاب کا سفر دیکھو

میکرہ بچھ گیا تو کیا رات ہے میری ہمنوا
سایہ ہے میرا ہم سبوح پانڈ ہے میرا ہم سخن

کے ملیں کہاں جائیں کہ رات کالی ہے
وہ شکل ہی نہ رہی جو دیتے جلاتی تھی

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آلے شبِ زنی تجھے گھر ہی چلیں

یاد کی نگری کو سوں دور کیسے کٹے گی بھاری رات

کئی دن رات سفر میں گزریں آج تو چاند لبِ جو نکلا

شہرِ گل میں کئی ہے ساری رات دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے

اولیں شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی
اجنبی مہک پا کر ہم نکل پڑے گھر سے

ناصر نے رات کے وقت تلاش اور ڈھونڈنے کا عمل جاری رکھا تو پھر ہوا یوں کہ وہ رات کو
جگانے والے بن گئے اور رات انھیں جگانے آنے لگی۔ ناصر دھندلی دھندلی فضاؤں میں کچھ ڈھونڈتے
ڈھونڈتے دور نکل جاتے۔ کوئی نہ ملتا تو خود ہی بیولے بناتے اور آخر یوں ہوتا کہ،
سو گیا پھلپلی رات کا جادو کوئی اب بے چلے یہاں سے دور

صبح کا تارا بھر کر رہ گیا رات کا جادو بھر کر رہ گیا

دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں ہم نہ سو جائیں اب تو ڈر ہے یہ

خاک بھی اڑ رہی ہے ستوں میں آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

دن کا چراغ نکلا گل ہو گئے تارے
دنیا کے شور و غل میں دل اب کسے پکارے

یوں زندگی کے رات دن گزارتے گزارتے وہ وقت بھی آ گیا کہ،
وہ میکہ سے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اُس کے جی میں آئی کہ شام بہتے ہی گھر گیا وہ

وہ رات کا پے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
 تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ
 اور آخرات اکیلی رہ گئی۔ اس لئے کہ :

وہ ہجر کی رات کا ستارا وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
 سدا رہے اُس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ
 اور رات کی آنکھوں میں شبنمی آنسو اتر آتے :

کہیں کہیں کوئی روشنی ہے
 جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے

کہاں ہے وہ اجنبی مسافر
 کہاں گیا وہ اداس شاعر

ناصر کے ہاں قافلوں کی گھنٹیاں بھی بجتی ہیں۔ یہ قافلے اپنے اندر ہجرت کے دکھوں کی گھڑیاں
 اٹھائے رواں دواں ہیں۔ یوں تو ہجرت نے کردہ حقیقتوں کے علاوہ ناصر کو حسین یادوں کے غزانے
 بھی فراہم کئے لیکن یہی ہجرت ان کی شاعری کو حُسن بخش دینے والے کاروانوں اور قافلوں کے مناظر
 اور استعارے بھی دئے گئی۔ ان سے پہلے بھی غزل میں قافلوں اور کاروانوں کا ذکر آیا ہے لیکن سنی سنائی
 کی بات اور ہے اور دیکھی اور محسوس کی ہوئی بات بالکل الگ چیز ہے۔ ناصر نے تو تجربوں کے کرب
 سہے، تب جا کر ہمیں بھی یہ محسوس ہوا کہ ہم خود ناصر کے ساتھ قافلوں اور کاروانوں کے مسافر بن گئے۔
 ہیں۔ کارواں ناصر کے ہاں صرف ہجرت کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ لفظ تو اب ایک معاشرے،
 ایک تہذیب اور پھر ایک قوم اور ایک ملک کا استعارہ بن گیا ہے :

شہر خلقِ خدا سے بیگانہ کارواں میر کارواں سے دور

کارواں سست را بہر غلوش کیسے گزرے گا یہ فرخاموش

رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا
 قافلے والوں میں کس کو کس کی پروا ہے نہ پلوچھ
 ناصر کبھی تو کاروانوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ؛
 منزل نہ ملی تو تافلوں نے

رستے میں جمائے ہیں ڈیرے
 جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
 بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

رودادِ سمنرنہ چھیڑنا ناصر

پھراشک نہ تھم سکیں گے میرے

اور کبھی کبھار جھٹک جاتے اور کھوٹی ہوتی تہذیبی اقدار کے کاروانوں کی گھنٹیوں کو سننے کی کوشش
 میں دور نکل نکل جاتے۔ اس لئے ان کے ہاں چلنے پھرنے اور سفر کرنے کا ذکر بہت آتا ہے۔ پھر
 ان کے ہاں آبدِ صبح، منہ اندھیرے، قافلے، منزل، رستے، شفق، کنارہ، بستی
 کا بیان بھی ہے اور رفتگان کی یاد بھی ؛

آکے منزل پہ آنکھ بھرا آئی سب مزہ رفتگان نے چھین لیا

خبر نہیں وہ مرے ہمسفر کہاں پہنچے
 کہ رہ گزر تو مرے ساتھ ہی پٹ آئی

شکستہ پارہ میں کھڑا ہوں نگتے دنوں کو بلا رہا ہوں
 جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سمنرنہ گیا وہ

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر، نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ، کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

لیکن ناصر نے انتظار جاری رکھا، اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ کھوئی ہوئی چیزوں کا سراغ مل ہی جائے گا:

رہ نورِ دیبا بنِ غم صبر کہ صبر کہ
کارواں پھر ملیں گے ہم صبر کہ صبر کہ

دراصل ناصر مکمل اور سچے فنکار تھے اور ایسے فنکار ایک سدا بہار زندگی، ایک ہمیشہ رواں رہنے والے دریا کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقی روانی کبھی نہیں تھمتی۔ ان کے ہمکنی لہروں والے دریا کا پانی خشک نہیں ہوتا۔ اس لئے ناصر کے ہاں بھی تخلیقی سفر جاری رہا۔ ان کے فکر و فن میں مثبت تبدیلی آتی رہی اور ترقی ہوتی رہی۔ اسی ناصر کے فکر و فن "برگ نے" سے "دیوان" اور پھر پہلی بارش "یک مسلسل ارتقا پذیر رہے۔ ناصر سے ٹی وی انٹرویو میں جب سوال کیا گیا کہ 'برگ نے' کے بعد تم کیا کرتے رہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ناصر کاظمی خاموش ہو گیا' تو ناصر نے جواب دیا: 'برگ نے' کے بعد دراصل میری شاعری کا جو ایک لحاظ سے بہتر اور باقاعدہ تخلیقی دور ہے میرے خیال میں وہ — اتنا خوبصورت دور تو نہیں لیکن وہ 'برگ نے' کے بعد ہی شروع ہوا۔ میں 'برگ نے' کے بعد لکھتا رہا اور لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر چھپتا کم رہا ہوں۔ دراصل میری زندگی کا تو مقصد ہی بھلا یہ ہے کہ فرصت کماؤں اور اس فرصت میں شعر لکھوں۔ یہ اپنی شاعری کے شروع زمانے میں

ناصر نے ایک گفتگو کے دوران میں حنیف رائے کی بات کا جواب مبہم طریقے سے بالکل رومانوی انداز میں یوں دیا تھا :

”حنیف رائے :..... ریل گاڑی کا مسافر روایت اور تجربے کا سنگم ہے۔ وہ بیک وقت موجود بھی ہے اور غائب بھی۔ وہ نہ تو معاشرے میں گم ہے اور نہ معاشرے سے بالکل کٹا ہوا ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے وہ تنہا ہے۔“

ناصر کاظمی :- یہیں سے فرد کی تخلیقی تنہائی شروع ہوتی ہے۔ جو ہرن زخمی ہو جاتا ہے ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بن میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے۔“

یہاں یہ بات الجھ جاتی ہے کہ آخر کیلارہ کر بھی اجتماع کا مستقل شعور کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔ لیکن تقریباً پندرہ بیس سال بعد وہ کہتے ہیں :

بات یہ ہے کہ باہر کی چیزیں جب اچھی لگتی ہیں جب آدمی کے اندر کچھ زندگی ہو۔ دریا اس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو :

ع۔ میر دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی

تو یہ دریا کا احساس تو اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، دریا مزاج۔ اسی طرح سے درخت ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ یہیں سے تو دنیا شروع ہوئی۔ سو یہ درخت تو Growth کا Symbol ہے اور میری شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ درخت، شہر، چاند، پھول، فطرت Romantic چیزیں نہیں ہیں۔ انتظار حسین !! دراصل یہ ایک بڑی مہذب تہذیب، جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا ہے،

اس کے استعارے ، اس کی زندہ علامتیں ہیں۔ آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں ، پرندے ہوں ، کبوتر ہوں ، چڑیاں ہوں ، آسمان کھلے ہوں وہ کوئی Romance نہیں Romantic کون کہتا ہے اسے !!! اس کے پیچھے تصور کرد اس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہیں گے جنہوں نے وہ پھول لگائے ہیں ، وہ "درخت" بنائے ہیں۔" لے

اب ان دو مختلف اوقات میں کہی گئی باتوں میں بہت فرق ہے اور پہلی بات سے دوسری بات تک کے درمیان تقریباً پندرہ برس کی مدت ہے اور اس عرصے میں ناصر کی فکر میں واضح تبدیلی سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ اب ان کی شاعری کی ہر چیز کی وابستگی زندگی سے ، ارد گرد کے ماحول سے ، معاشرے اور انسانیت سے ہو جاتی ہے۔ اب زخم کھا کر تنہائی میں نکل جانے والا ہرن ناصر کے نزدیک اجتماعی شعور کا نہیں رہا ہے۔ اب وہ فطرت کے پیش منظر میں نظریں گاڑ کر پس منظر میں جاتے ہیں جہاں انسانی معاشرہ سرگرم عمل ہے ، اور پھول کر محض اس لئے نہیں دیکھتے کہ پھول ہے اور خوبصورت ہے۔ اب وہ یہ پھول اور درخت لگانے والوں ، انھیں پروان چڑھانے والوں ، ان پر محنت کرنے والوں کے بارے میں بھی سوچنے لگے ہیں۔

ناصر کو جو شروع میں ادا سیاں ملیں انہوں نے ناصر کو جلا کر راکھ نہیں کر دیا بلکہ ناصر نے ان ادا سیاں کو اپنے اندر تحلیل کر لیا۔ یوں اس راکھ سے جو سورج طلوع ہوا وہ رجائیت کا سورج ہے۔ اس کی کرنیں ناصر کی فکر میں مثبت تبدیلیوں یعنی امید اور رجائیت کی عکاس ہیں۔ اس رجائیت کی چنگاری جو شدید غموں اور صدموں سے پہلے بھی ان کے اندر بسی ہوئی تھی ،

میلوس نہ ہر ادا اس راہی پھرتے گا دور صبح کا ہی

یہ چنگاری اب دیوان "میں آکر امید کی صورت میں بھڑک اٹھی ؛
گہری نیند سے جاگناصر وہ دیکھو سورج نکلا ہے

گئے دنوں کی لاشس پر پڑے رہو گے کب تک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آگیا
تلخ حقائق اب ان کے میٹھے خوابوں کو کڑواہٹ نہیں دیتے بلکہ اب تو وہ اس کی فکر بھی
کرتے ہیں کہ آخر چاروں طرف اتنی تلخی کیوں ہے ؟ آخر چند لوگوں نے کیوں ڈھیر سے
لوگوں کے خوابوں تک سے شیرینی چھین لی ہے ؛

کڑوے خواب عزیزوں کے میٹھی نیند امیروں کی

چند گھرانوں نے مل جل کر کئے گھروں کا حق چھینا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے تیرے پاؤں تلے سونا ہے

جھوٹی امید کا فریب نہ دکھاؤ رات کالی ہے کس قدر دیکھو

ایک انوکھی بستی دھیان میں بستی ہے اس بستی کے باقی مجھے بلاتے ہیں

یہ بھی آرائش بستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقہ فکر سے میدان عمل میں آئے
میٹھے ہو کیوں ہار کے ، سائے میں دیوار کے
شاعر ، صورت گرد کچھ تو کیا چاہیے

یار دم تو ایک ڈگر پر ہار کے بیٹھ گئے
ہم نے تپتی دھوپ میں کاٹے کڑے کوس کے پھیر

لہو کی شمعیں جلاؤ قسم بڑھائے چلو
سروں پہ سایہ شب ہاتے تار اگر ہے بھی

اور پھر انہوں نے تسلی آمیز اور توقع سے بھرپور لہجے میں کہا:

کچھ نئے لوگ آنے والے ہیں گرم اب شہر میں خبر ہے یہ

یہ بجا کہ آج اندھیر ہے ذرا رت بدلنے کی دیر ہے

جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

اور راتھی رت بدل گئی۔ ناصر کی ڈھکی چھپی فکر کی کلی بھی کھل کر پھول بن گئی اور انھوں نے سب لگی لیٹی

چھوڑ کر واضح طور پر کہہ دیا:

یہ خاص دعام کی بے کار گفتگو کب تک

قبول کیجیے جو فیصلہ عوام کریں

ناصر کو یہ خوف تو تھا کہ:

دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں ہم نہ سوچا میں اب تو ڈر ہے یہ

لیکن ناصر میں جو اب امید کی قوت اکٹھی ہو گئی تھی اب اسے اندھیرے بکھیر نہیں سکتے تھے:

وقت اچھا بھی آتے کا ناصر غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ناصر کا ظنی صحیح معنوں میں انسانی زندگی کے شاعر ہیں۔ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں سے انھوں

نے دلچسپی لی ہے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان پر غور کیا ہے اور اس طرح زندگی کی بعض

اہم حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے۔ ان حقیقتوں کی تہہ تک وہ محسوسات کے راستے سے پہنچتے ہیں۔ ان

کے یہاں فکری پہلو غالب نہیں ہے۔ وہ فلسفی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی سے ان کی دلچسپی

ذہنی اور فکری ہونے کی بجائے محسوساتی اور عملی زیادہ ہے اور اسے دیکھنے، سمجھنے، برتنے اور بسر کرنے کے خیالات ان کی عزتوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے اس میں زندگی اور جولانی کا پتہ چلتا ہے۔ اور تنوع اور رنگارنگی، وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ ناصر بہت گہری بلقیں تو نہیں کرتے لیکن سادگی سے کہی ہوئی یہ باتیں دل کو لگتی ضرور ہیں۔ ایک کسک سی ہوتی ہے۔ جذبے، احساس اور فکر میں ایک دھیماسا ارتعاش بلکہ اضطراب پیدا ہوتا ہے :

میں نے تو اک بات کہی تھی کیا تو سچ مچ روٹھ گیا ہے
کھر کی کھول کے دیکھ تو باہر دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے

شور برپا ہے خانہ دل میں کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا جلنے کس چیز کی کمی ہے ابھی

کانٹے چھوڑ گئی آندھی لے گئی اچھے اچھے پھول

ذرا سی بات سہی تیرا یاد آجانا
ذرا سی بات بہت دیر تک راتن تھی

دھیان کی بیڑھیوں پہ کھلے پیر کوئی چکے سے پاؤں دھرتا ہے

دل تو میرا ادا ہے ناصر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

پھر ناصر کے شعروں میں ایک اور اہم بات اور ناصر کی انفرادیت کی ایک اور جھلک اس میں نظر آتی ہے کہ وہ اپنی تہذیبی اقدار کو نہیں بھولتے اور اپنے تہذیبی ورثے کو اس طرح شعروں میں سموتے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے یہ کوئی مقامی شاعر ہے۔ اسی پاکستان کا شاعر:

لال کھجوروں نے پہنے زرد بگولوں کے کنگن

ساری رات جگاتی ہے بیٹے لمحوں کی جھانجن

جب نکلتی ہے نگارِ شبِ گل منہ پہ شبنم کی روا ہوتی ہے

کیا تماشا ہے کہ بے ایام گل ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

عزل صرف فکر و تخیل سے ہی حسین اور لازوال نہیں بنتی بلکہ اس میں فنکار کا فن بھی شامل ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی کی عزل اس لحاظ سے بھی جدت اور نیا پن لئے ہوتے ہیں۔ یوں تو عزل کا ایک مخصوص حسین خاکہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے لیکن بڑے شاعر اس میں بھی رنگ تو اپنے ہی بھرتے رہے ہیں۔ آئیے اب ناصر کی عزل کے چند ایک فنی پہلو دیکھیں۔

عزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی پہلو میں کسی مخصوص بحر کے انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ فارسی اور اردو میں جتنی بحریں بھی رائج ہیں ان سب کا آہنگ مختلف ہے اور ان میں سے ہر ایک انسانی ذہن کی بعض مخصوص کیفیات سے مناسبت اور مطابقت رکھتی ہیں بعضوں کی موسیقی پُرشو ہوتی ہے۔ ایسی بحروں کے اندر پہاڑوں کے دامن میں بہتی ہوئی ندیوں کا سا جوش ہوتا ہے۔ یہ بحریں انسان کے جذبات کی شدت، اس کے ذہنی پیمانے، اس کی طبیعت کی پُرشو کیفیت اور اس کے مزاج کی شور و شکر کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بحروں کے اندر میدانوں میں بہتی ہوئی ٹبک خرام جو تے رواں کا سا ترنم ہوتا ہے۔ ان میں ایک

آہستہ رومی اور نرمی کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ یہ بحریں ان کے انتخاب کرنے والے کے مزاج کے دھیمے پن، طبیعت کی نجھی ہوئی کیفیت، جذبات میں ایک قسم کے ٹھہراؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح بعض بحریں چھوٹی ہوتی ہیں، بعض طویل، بعض آسان ہوتی ہیں اور بعض مشکل اور سنگلاخ۔ ان بحروں میں سے مخصوص ذہنی جذبات اور کیفیات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے مخصوص بحروں کا انتخاب غزل گو شاعر کے شعور پر دلالت کرتا ہے۔ بڑی حد تک اس انتخاب پر غزل کے تاثر کا انحصار ہوتا ہے۔“

ناصر کاظمی دھیمے لہجے کا شاعر ہے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے دکھوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنے ماحول کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور ایک انوکھی سادگی سے انھیں بیان کر دیتا ہے۔ ناصر ایک حقیقت پسند رومانوی شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں دو طرح کے لہجے ہیں: ایک نرمی سے بات کہنے کا انداز اور دوسرا نہایت اعتماد اور وقار سے ذرا بلند لہجے میں گفتگو کا انداز لیکن شائستگی بہر حال دونوں آوازوں میں موجود ہے اور یہی شائستگی ہے جو شروع سے آخر تک ان کی غزل کو نرمیاں دیتی ہے۔ ایک گھمبیرتا ہے جو ناصر کی شخصیت اور ان کی غزل کو بلندیوں کی طرف لئے چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایک چیخ بلند ہوتی ہے لیکن یہ شہنائی یا بانسری کے سب سے اونچے سُر کی سی ہوتی ہے۔ اس میں آرکسٹرا والے شور کی سی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مناسب ہو گا اگر ہم ”برگ نے دیوان“ اور پہلی بارش“ کی بحروں پر ایک نظر ڈال دیں۔ اس لئے کہ بحریں ہی تو لہجے متعین کرتی ہیں۔ ناصر کی پسندیدہ بحر ”رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ“ (فاملاتن مفاعیلن فعلن ہے) اس بحر میں انھوں نے ”برگ نے“ کی ۱۵ غزلیں اور دیوان“ کی ۷ غزلیں کہیں۔ ان کی دوسری پسندیدہ بحر گرفتہ“ دل میں بہت آج تیرے دیوانے“ (مفاعلات فعلن فاعلن فعلن) ہے۔ اس بحر میں برگ نے“ کی ۹ غزلیں کہیں اور دیوان“ کی ۱۴ غزلیں اس بحر میں ہیں باقی بحروں کی تعداد یوں ہے:

دیوان	برگ نے	بحر
۱۳	۷	۳ - ختم ہوا تاروں کا راگ
۷	۱۱	۴ - کچھ تو احساسِ زیاں تھلا پہلے
-	۹	۵ - کیا دن مجھے عشق نے دکھائے
۱	۲	۶ - بھرتی ہے نیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
۴	۲	۷ - حاصل عشق ترا حُسنِ پشیمان ہی سہی
۲	۴	۸ - ترے ملنے کو بے گل جو گئے ہیں
۴	۲	۹ - کم فرضتی خوابِ طرب یاد رہے گی
۲	۱	۱۰ - دورِ فلک جب دھراتا ہے موسمِ گل کی راتوں کو
-	۲	۱۱ - نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے
۱	۱	۱۲ - گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
۱	۱	۱۳ - کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا
۱	۱	۱۴ - دن ڈھلارات پھر آگئی سورج سو رہو
۲	۱	۱۵ - ہر ادا آپ رواں کی لبر ہے
-	۱	۱۶ - قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں

مندرجہ ذیل بحریں صرف دیوان میں اپنائی گئیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ناقص کر کے لہجے میں
دست اور تنوع آگیا ہے،

دیوان	بحر
۲	۱۷ - پھر سادہ رُت کی پون چلی تم یاد آئے
۳	۱۸ - تو اسیرِ بزم ہے ہم سخنِ تجھے ذوقِ نالائے نہیں
۲	۱۹ - موسمِ گلزارِ ہستی ان دنوں کیا ہے نہ پوچھ

دیوان

بحر

۱

۲۰۔ ہم جس پٹیر کی پھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے

۱

۲۱۔ دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے

۱

۲۲۔ زمیں چل رہی ہے کہ صبح زوال زماں ہے

۲

۲۳۔ درد کا نٹا ہے اس کی چٹھن پھول ہے

۱

۲۴۔ رات ڈھل رہی ہے

۱

۲۵۔ کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے

۱

۲۶۔ چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرد

۱

۲۷۔ نئے کپڑے بدل کر باؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے

۱

۲۸۔ تو تے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانگین

۱

۲۹۔ کچھ کچھ نغمہ زن بسنت آگئی

۱

۳۰۔ غم ہے یا خوشی ہے تو

۱

۳۱۔ دیس سبز جھیلوں کا

۱

۳۲۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر کہہ رہے آیا کہ ہر گیا وہ

۱

۳۳۔ وہ ساحلوں پہ گانے ولے کیا ہوتے

پہلے بارش کی بحران سب سے مختلف ہے :

۳۴۔ میں نے جب لکھنا سیکھا تھا۔ یہ ختم ہوا تاروں کا راگ سے صرف ایک رکن کے اٹلنے کی

وجہ سے مختلف ہے۔ یوں ثابت ہوا کہ ناصر نے تقریباً ۳۴ مختلف بجز اپناتے۔ ان میں چھوٹی بگردوں کی

تعداد بہت ہے لیکن ناصر نے لمبی بحریں بھی استعمال کیں اور ان میں اچھی غزلیں کیں۔ یہی لیجوں کا تونہ

ہے کہ ناصر کی غزلوں کو ظاہر طور پر بھی پرکشش بنانے رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایسجری اور غفلت

بھی ہیں۔

ناصر کی ایسجری ایک بالکل نئی تازہ پکچر پیلری ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف مدہم رنگوں کی آمیزش نئی نئی ہے بلکہ خود تصویریں غزل میں پہلے کی بنائی ہوئی تصویروں سے مختلف ہیں۔ یوں بھی ہر شاعر اپنی ایک الگ ایسجری کا مالک ہوتا ہے، اور عموماً ایسجری (مثالیں ہی شاعر کی پہچان کرداتی ہے۔

’نئے ایسجری کی تخلیق کا دار و مدار شاعر کی قوتِ اختراع اور مشاہدے پر ہوتا ہے..... شاعری میں ایسجری کا غیر معمولی پن اور تازگی اس کی عظمت کا سیار نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد تجربے کو مخصوص انداز میں نمایاں کرنا ہے.....

’ایسج تخلیقی تجربے کو مماثلت کے ذریعے محاکاتی طریقے سے پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنے تجربات اور جذبات کو متبادب یا مماثلتِ اشیا میں شخص کر کے ایسج کی تخلیق کرتا ہے.....‘

’..... ایسج کے نزدیک یہ صرف اظہار کی ایک تکنیک ہے۔ ایڈرپاؤنڈے وسیع تر عمل گروانا ہے اور اس کے نزدیک اس کی غایت ذہنی اور جذباتی کو مپلیکس کو پیش کرنا ہے۔ شبلی اسے محاکات سے تعبیر کرتے ہیں ایسج کی تشریحوں کی گونا گونی کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق ادراک اور اظہار دونوں سے ہے۔ تخلیقی عمل میں جب شاعر تجریدی ادراک کی بجائے تصویروں اور مشاہدوں کے ذریعے اپنے تجربے کو گرفت میں لاتا ہے تو نتیجتاً ایسج پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایسج عموماً تجربات کا تصویری بیان ہے۔‘

’سادہ ترین الفاظ میں شاعرانہ مثال کی توصیف یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ الفاظ کے نقش و نگار سے بنی ہوئی ایک تصویر ہوتی ہے..... جان ڈلٹن سرے کہتا ہے.....‘ انسانی طبیعت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مثال میں جو مشابہت ہو وہ صداقت پر مبنی ہو اور ایسی مشابہت ہو جس کا ادراک ہمیں پہلے کبھی نہیں ہوا اور جس کا ظہور ہمیں ایک الہامی انکشاف معلوم ہو.....

”وہ قوت جو شاعرانہ تمثالیں پیدا کرتی ہے اور پھر ان کا دوسروں تک ابلاغ کرتی ہے تخیل ہے...“
 ”شاعر جو تمثالیں استعمال کرتا ہے وہ اس کے تمام دکل تجربہ زندگی سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ان کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر یہ تاثر چھوڑیں کہ وہ مضمون کی قدرتی زبان ہیں، یعنی مضمون نے خود بخود ان کو انتخاب کیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بغیر کسی محنت کے شاعر کو خود بخود سوچھ گئی تھیں...“

”شاعرانہ تمثالوں سے ہمیں وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو کسی بھولی ہوئی بات کے یکا یک یاد آ جانے سے یا کسی ہم دم دیرینہ کے مدتوں بعد ملنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ بقول بیٹس ہم کسی اور کے قالب میں نئے سرے سے جنم لے رہے ہیں، ہم اپنے ہم جنسوں کے مجموعی تجربات میں شریک ہو کر ان کے ساتھ ایک رشتہ وحدت کے احساس سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔“

یوں ایسجری شاعری میں ابلاغ کا کام دینے کے علاوہ اس کے حسن اور نکھار کا باعث بھی ہوتی ہے اور ناصر کی شاعری میں تو حسن ہی حسن ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار رکھے کہ خوبصورت تمثالیں ان کی غزل کو خوب توانائی دیتی ہیں۔ نئے اشاروں اور نئی علامتوں نے ان کی غزل کو ایک نئی فضا سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے نئی نسل کی مخصوص اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لئے ان گنت نئے پیکر تراشے ہیں۔ اسی لئے ان کی غزلوں کی ایسجری بالکل نئی اور اچھوتی لیکن مانوس معلوم ہوتی ہے۔ احساس کی شدت اور تخیل کی جولانی نے ان کی تشبیہات و استعارات میں کچھ ایسا رنگ دیا ہے جس سے زندگی پھوٹی پڑتی ہے۔ ناصر کی غزل میں تکلف اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک سادہ اور پُر خلوص انسان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ خلوص اور صداقت اس کا جو برہ ہے۔ سادگی اور صفائی اس کی جان ہے اور اس کی جھلکیاں اس کے اسلوب میں بھی نظر آتی ہیں جو ان کی غزل کی بنیاد ہے۔ برجستگی اور بے ساختگی، شگفتگی اور شادابی،

توازن اور ہم آہنگی اور صفائی سادگی سے ملی جلی رنگینی اور پرکاری اس اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں..... غزل کا ایک ایسا نیا اور اچھوتا انداز اور اسلوب نظر آتا ہے جس سے اس کی روایت اب تک نا آشنا تھی۔

ایم جی کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ ان میں سے سب سے عام اور نمایاں بصری ایم جی ہے۔ جب شاعر لفظوں کے ذریعے ایسی تصویر مرتب کرنے جس کا تعلق بھارت سے ہو اسے بصری ایم جی سے تعبیر کیا جاتا ہے..... سماجی ایم جی میں شاعر الفاظ کے ذریعے ایسا منظر مرتب کرتا ہے جس کا رشتہ بھارت کی بجائے سماعت سے ہوتا ہے۔ پھر ایک قسم مرکب ایم جی کی بھی ہے۔

ناصر نے جیسا کہ بتایا تھا کہ انھیں ہر فن لطیف سے دلچسپی رہی ہے۔ پھر انہوں نے موسیقی بھی سیکھی اور مصوری کو بھی کافی مدت تک اپنا یاد یوں شاعری جو تقریباً سبھی فنون لطیفہ کے رنگ اپنے اندر رکھتی ہے، نافر کے ہاں مصوری کے حسین شاہکاروں کی عکاس بن گئی۔ یہ تو درست ہے کہ نافر نے شاعری کو ہمیشہ بطور شاعری ہی اپنا یاد کر بطور موسیقی یا مصوری کے لیکن وہ اس کے قائل تو تھے کہ شاعری کی وسیع سلطنت میں موسیقی اور مصوری کو بھی مقام حاصل ہے۔ انہیں یوں بھی مصوری سے بہت دلچسپی تھی۔

سوزن اینگر صنف کے شدہ ہونے کی بڑی قائل ہیں۔ مثلاً یہ کہ موسیقی کو بطور موسیقی اپنانا چاہیے۔ اس سے شاعری کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس سے بعضوں نے یہ سمجھا کہ فن کی اصناف کا آپس میں کوئی ربط ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس نے استعارہ، اسم اور ایم جی پر جو بحث کی ہے اس سے صاف نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ فن کی ایک صنف دوسری صنف سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ میں نے تصویریں دیکھنے سے پہلے

How to look at a picture کے

قسم کے نئے نہیں پڑھے۔ تصویریں دیکھنا مجھے انیس نے سکھایا۔

کھڑے نکلے بھیجے سے جو لے کر علی اصغر کو حسین

مرثیہ شروع ہوتے ہی سننے والا کر بلا کے میدان میں پہنچ جاتا ہے۔

اب سب سے پہلے ہم ناصر کی بصری مثالوں کو دیکھتے ہیں بصری ایسجری میں بھی دو طرح کی تصویریں بنتی ہیں ساکن حرکت۔ ناصر کی ساکن مثالیں اس طرح کی ہیں:

ردیوان، "رتے کھکھانی"، "سنان گل"، "بے خواب دریچہ"، "چپ چاپ طیور"، "بام و در خاموش"

"میت شہر بے کفن"، "بستی چین سے سو رہی ہے"، "یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں"، "بکھے دنوں

کا ڈھیر" (برگ نے)، "پٹ کے سور ہونے بجیر در سے"، "اُداسی بال کھوئے سو رہی ہے"، "یادوں کے بکھے

ہوتے سویرے"، "برگ گل کی چھاؤں"، "صنم خانہ گل"، "دھیان کی سیڑھیاں"، "پھولوں کے خزانے"

"جسم چاندنی کا شہر ہے"، "سنان آسماں، چپ کھڑے مکاں"، "سور ہا تھا یاد کے شبستاں میں"،

"انگشتہ منائی"، "شب خزاں کی خنک چاندنی کا نظارہ"، "شہر گل"، "بجھا بجھا سا ایک دیا"، "سوکھ

گئے بستے دریا"، "چاند میں سو گئی چاندنی"، "کھڑی ہے در پہ میرے سر جھکائے شام فراق" اور

تھنڈی دھوپ کی چھتری تانے پیر کے پیچھے پیر کھڑا تھا

چاند بھی پتھر، جھیل بھی پتھر پانی بھی پتھر لگتا تھا (سپلی بارش)

اب ناصر کی حرکتی مثالیں دیکھیں جو نہ صرف خود حسین ہیں بلکہ زندگی کی بچل کے حُسن کو بھی ظاہر کرتی

ہیں (ردیوان) کرن پریاں اترتی تھیں، "دیوار سی گری ہے"، "دور کھڑے خالی ہاتھ ہلاتے ہیں، پتوں

کا مید"، "ناؤ چل رہی ہے"، "آگ جل رہی ہے"، "پھولوں کی ڈالی"، "ہاتھ مل رہی ہے"، "اڑٹھا

ہے بھوم کر"، "نگی ہے آگ کنارے پر"، "چلتا صیا۔ تیز یون"، "بندیں بھٹکتی پھرتی ہیں"، "آگ سی لگ

گئی درختوں میں"، "دیا جلتا رہا ہے"، "سایہ ہے میرا ہم سب"، "نہیں اڑا کر اڑ گئی چڑیا"، "دکھ کی لہر

"بیٹے لمحوں کی جھانجھن" بارشیں تیروں کی " سفینے چلنے لگے یاد کے سراپوں میں " مثالِ گردِ سفر گیا وہ " (برگ نے) اڑ گئے شاخوں سے طیور " قافلہ بگولوں کا " پاؤں چلنے لگی جلتی ہوئی ریت " دشت سے جب کوئی آہونکلا " بگولے اڑتے پھرتے ہیں خشک جنگل میں " تاشِ آب میں غزالِ آواہ " درد کی طغیانیاں " واہو اور میخانہ گل " رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری " کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے " ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے " جنگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے " محروم خواب دیدہ حیراں " اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی " دن کا سہرا نغمہ سن کر۔ اہلی شب نے موڑی باگی "

دن کا پھول ابھی جاگا تھا

دھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا (پہلی بارش)

حسنِ بھارت کی کچھ اور مثالیں: کہیں کہیں کوئی روشنی ہے " درو دیوار ویراں شمع مدھم چراغوں کا دھواں " وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول " یک بیک آکے دکھا دو جھمکی " لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں " دلیں سبز جھیلوں کا "۔

ناصر کے ہاں حسنِ سامعہ کی مثالیں آواز کو بھی جسم و جاں دے جاتی ہیں۔ پھر کوئی نغمہ گلو گیر مویا " پھر پتوں کی پازیب بچی " کوئی نامانوس اُداس نوا کچھ کہتی ہے " مجھ سے باتیں کرتی ہے خاموش تصویروں کی " پائی کر لاتی کونجیں " ہر شے پکارتی ہے بس پر دہ سکوت " آہ بھی نغمہ بنا چاہتی ہے " شور برپا ہے خانہ دل میں۔ کوئی دیوار سی گری ہے ابھی " ریل کی گہری سیٹیں سن کر۔ رات کا جنگل گونجا جوگا " چپکے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر " بیٹے لمحوں کی جھانجھن " خوشی انگلیاں چٹنی رہی ہے " دل کی دھڑکن کہتی ہے " سنٹوں میں سننے ہیں بسنی سنائی کوئی بات " میٹھی بولی یہ پیپے پو لے۔ گنڈنا تاہو جب تو نکلا " گھنٹیوں کی صدا سو گئی " پھر زور سے قہقہہ لگاؤ " اور یہ

غزل تو ساری کی ساری اسی ذیل میں آتی ہے :

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن

کیوں ہے یہ شورِ پیا غور سے سن

ناصر کے ہاں خوشبو میں بھی اپنی جھلک ضرور دکھاتی ہیں: خوشبوؤں کی اداس شہزادی "ہلکی ہوئی سانسیں" نے اڑی سبزہ خود رو کی ہلک "لئے پھرتی ہے کوئی باس اداس" رستوں میں اداس خوشبوؤں کے۔ پھولوں نے ٹاڈیے خزانے "کوئی آوارہ ہلک یاد آئی" اجنبی ہلک پا کر ہم نکل پڑے گھر سے۔ کچھ تمنایں مفرد ہوتی ہیں اور کچھ مرکب۔ مفرد تمناؤں میں ایک حس کی تصویر بنتی ہے جبکہ مرکب میں دو یا دو سے زیادہ حسوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ناصر کی مرکب تمنا میں کچھ اس طرح کی ہیں: جس سامعہ۔ جس بصارت۔ "سن کے طاؤس رنگ کی جھنکار" دن کا سنہرا نغمہ سن کر "پردہ گل ہی سے شاید کوئی آواز آئے" بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکر ناز۔ بھلا رہی ہے ابھی تک وہ دلنشین آواز "کسی گل نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے۔ گزر گئی جس گل اداس کر کے مجھے" رنگ حسوں کے راگ شاموں کے "زمزم ریزہ ہوئے اہل چین" دل میں اک عمر جس نے شور کیا۔ وہ بہت کم رہا ہے آنکھوں میں "چینتی ہیں ڈراؤنی راتیں۔ چاند نکلا ہے آسمان سے دور" پھر درد نے آگ راگ چھیڑا "سن کے آوازہ زنجیر صبا" اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی "دیکھ کر آئینہ آبِ رواں۔ پتہ پتہ لب گویا ہوگا" دن کا چسراغ نکلا گل ہو گئے ستارے۔ دنیا کے شور و غل میں دل اب کسے پکارے "ریگ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا۔ سونے صہرا چرخ اٹھتے ہیں۔ آدھی آدھی راتوں کو" کیسے سنان ہیں آسمان، چپ کھڑے ہیں مکان "پھر سیر شام کوئی شعلہ نوا سو گیا چھیڑ کے افسانہ گل "سن شگفتگی غنچہ کی صدا" گل ریز میری ناکش سے ہے شاخ شاعر "پھر کونجیس بویں گھاس کے برے سمندر میں" سنا تا ہے کوئی بھولی کہانی۔ ہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی "ذف بجائیں گے برگ و شجر صفت بہ صفت بر طرف نیل دھندل خاموشی میں "چلنا دریا، دھلتی رات۔ سن سن کرتی تیز پون" جلوہ رنگ بھی ہے اک آواز جس ایک موتی کی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر۔

تین حسوں کی مرکب تمنا میں دیکھیے۔ جس بصارت۔ جس سامعہ۔ جس سامعہ

وہ برے گل تھا کہ نغمہ جاں " اور

پون چلی تو گل و برگ رن بجانے لگے
اُداس خوشبوئیں بودے اٹھیں نقابوں میں

لمس کی حس اور حس سامعہ سے مل کر جو تمثالیں ہیں وہ یوں ہیں۔ "کرم اے صرصر آلام دوراں۔ دیوں
کی آگ بجھتی جا رہی ہے" ہوتے صبح نے چونکا دیا یوں۔ تری آواز جیسے دل سے گزری لمس کی اس
ایمبجری کا احساس پڑھنے والے کو کپکپا دیتا ہے۔

ہاتھ بھی تک کانپ رہے ہیں وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا۔

ناصر زرد رنگ کا بہت ذکر کرتے ہیں۔ کہیں سبز، لال اور نیلا رنگ بھی جھلک جاتا ہے۔ ناصر کی
لفظیات میرے تھوڑی بہت مماثل ہونے کی باوجود اپنی ایک پُر قوت انفرادیت ضرور رکھتی ہے۔
"ناصر کی شاعری مخصوص لفظیات کی حامل ہے۔ ان کے یہاں دریا، چشمہ، بستی، بگولے، طیور، قافلہ
منزل، صحر، جنگل، شہر، چاند، صبح، طرب، شہر، طرب، جادو، گل، خوشبو، شہر، گل، رشتگان، جس،
نگری، بسیرا جیسے الفاظ نہ صرف یہ کہ بار بار استعمال ہوتے ہیں بلکہ نئے معنی اور خاص پس منظر میں
استعمال ہوتے ہیں۔" ناصر کاظمی نے نئے استعاروں سے بھی کام لیا ہے اور بعض اوقات جہاں الحان
غزل کو وہ اپنی آواز کی لرزش دینے میں کامیاب ہوتے ہیں، ان کی غزل تازہ نوائی اور نئے فنی
استخراق کا پتہ دیتی ہے۔ اگرچہ اپنے فن کی جمالیات تشکیل میں وہ ابھی تک منہمک ہیں
اور ابھی ان کی شاعری تراش و تراشش کے مدارج طے کر رہی ہے لیکن اس کوشش میں بھی وہ
ہمیں غزل کی نئی سمتوں سے آشنا کرتے ہیں۔

لفظ خود ناصر کو بے حد عزیز ہیں اس لیے کہ انھیں معلوم تھا کہ اس فن لطیف کے اظہار کے
لیے الفاظ کی خوب صورتیاں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے تو لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان

ملہ نظیر صدیقی۔ فنون جدید غزل نمبر ۶۹، (جدید غزل، پاکستان اور ہندوستان میں)

ڈاکٹر سینت فوق "فنون" جدید غزل ۶۹، (اردو غزل کے نئے زاویے)

بھی محسوس کی ہے اور ان کے پیچ و خم کی وسعت زیادہ بھی نئی ہے۔ یہ حرف "ب" فیضی کا اسم تھا۔ خیر یہ تو لمبا قصہ ہے، ایک شعر سن لو:

اٹھاتا ہوں جب طاق سے میر صاحب کا دیوان
ورق بولتے ہیں کہ لفظوں کی قوسوں میں جہاں ہے "ب"

"جس نے لفظ ایجاد کیا وہ پہلا شاعر تھا، اور افسانہ نگار بھی شروع میں سب لفظ شعر اور افسانے تھے۔ بنیوں نے شاعروں اور افسانہ نگاروں پر خار کھپایا اور ان شعروں اور افسانوں سے کاروباری کام شروع کر دیتے اب زبان ایک سماجی ضرورت کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری اب یہ ٹھہری کہ ان لفظوں کے نیچے دیئے ہوئے افسانوں اور شعروں کو باہر لایا جائے۔" ۱

ناصر کے ہاں لفظ موسیقی کے نرم سُروں کے آثار چٹڑھاؤ کا ساتھ دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نرم صوتوں کے استعمال سے ان کی غزل آہستہ آہستہ دل میں سمائی جاتی ہے۔ وہ لفظوں کی تکرار سے بھی موسیقی کا حُسن قائم کر لیتے ہیں اور حرفوں کی صوتی خوبصورتی سے وہ بے خبر نہ تھے۔ ناصر نے ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا جو الفاظ و اصوات پر لکھی گئی تھیں۔ ناصر کے پسندیدہ حرف "ش" "ن" "غ" "ب" "م" اور "ی" وغیرہ یعنی وہ نرم اصوات، نرم سُروں کو اپناتے تھے۔

آخر میں "برگ نئے کی ایک غزل ردن ڈھلاوات پھرا گئی سورہو سورہو" اور "دیوان" کی ایک غزل "رہ نور دبیا بان غم صبر کر صبر کر" کو آئینے سامنے رکھ کر انہیں عکس رد عکس دیکھنا دلچسپ ہے گا۔ ان دو غزلوں کو چھننے کی کچھ وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ دونوں غزلیں ایک ہی بحر میں ہیں اور ناصر نے کوئی اور غزل اس بحر میں نہیں کہی۔ پھر ان کی ردیفوں میں بھی ایک مماثلت ہے اور

۱۔ ناصر کاظمی، "سوریا" ۱۹-۲۰-۲۱ (ایک مکالمہ "رفار کا بدن" ص ۴۹۴)

۲۔ ناصر کاظمی، "نیادوز" ۷-۸، "نیا اسم" ص ۱۰۰

سب سے اہم بات یہ ہے کہ بعد کی غزل پہلی غزل کی کچھ باتوں کی وضاحت کرتی ہوتی، کچھ سوالوں کے جواب دیتی ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ اس پر کھ سے ناصر کے فکر و فن میں ارتقائی صورت بھی ظاہر ہوگی۔

یہ دونوں غزلیں بہت خوبصورت ہیں: برگ نے "کی غزل میں رات کا گہرا مشاہدہ ہے۔ پھر اس ساری غزل میں نرمی ہے، ایسی نرمی جو دھیمی پڑتی ہوئی بائبل گم ہوتی، سو جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دیوان کی غزل نیند سے ابھی ابھی چونک کر اٹھ بیٹھنے کے بعد ارد گرد کی فضا کو پہچاننے اور پھر اپنے آپ کو اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ برگ نے "والی غزل میں ناصر سو رہنے کو ہی زیادہ مناسب سمجھتے ہوئے اس کا مشورہ دیتے ہیں۔ کبھی موسم کی خوبصورتی اور غنودگی کا بہلا وادے کر اور کبھی مایوسی کی شناخت کروا کے سونے پر مجبور کراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن "دیوان" کی غزل میں جیسے وہ خود سونے والوں کو آہستگی سے جگا کر انہیں سمجھا رہے ہیں کہ "صبح روشن" آنے میں کچھ ہی دیر ہے بس ع اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ وہ کمال طور پر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے والے صبر کی تلقین نہیں کر رہے بلکہ صبر کے ایک عارضی وقفے کی تھپکی دے رہے ہیں۔ دراصل "دیوان" کی غزل کی آمد کی اطلاع "برگ نے" کی یہ غزل دے چکی تھی۔ یہاں میں اشعار اس ترتیب سے درج کروں گی جس ترتیب سے ایک شعر کی کشش نے دوسرے شعر کو اپنی جانب کھینچا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ دو انسان بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک "برگ نے" کا مایوس واد اس ناصر ہے اور دوسرا "دیوان" کا پُر اعتماد اور نپرا میدان ناصر۔ آئیے ان دوستوں کی گفتگو سنیں:

دیوان

برگ نے

وہ نوردیبا باجی منم صبر کہ صبر کہ
کارواں پھر میں گے ہم صبر کہ صبر کہ

دن و حلا راست۔ پھر آگنی سو ہو سو ہو
منزوں میں گئی خاموشی سو ہو سو ہو

پانچواں باب

ناصر کی نظم اور نثر کا حباب تازہ

(۱) نظم

اصل بات یہ ہے کہ ناصر کاظمی کا مزاج غزل گوئی کے لئے ہی مناسب ترین تھا۔ بے شک تخیل، فکر جذبہ و احساس کے شاعرانہ اظہار پر غزل، نظم یا نثر کی قید نہیں لگائی جاسکتی لیکن انسان ایک کائنات ہوتے ہوئے جس میں ایک اور وسیع تر کائنات کا مناسبا نقطہ بھی ہے۔ یوں وہ اپنے بازوؤں کی وسعت میں بہت کچھ سمیٹ تو سکتا ہے لیکن اس بہت کچھ میں سے ہر ایک کی مناسب حفاظت کا حق ادا کر سکتا۔ ہر ایک کے لئے ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ناصر اگر نظم گوئی پر بہت توجہ دیتے تو اس صنف میں بھی ایک نئی، بالکل الگ سی نظم کو تخلیق کر دیتے، لیکن جب غزل ہی ان کے تخلیقی جذبے کی مکمل تسکین کر رہی تھی تو وہ کسی اور صنف کو منہ کا ڈالنا بد لئے کے لئے ہی اپناتے تھے۔ دراصل انھیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی کہ :

بے تدر شوق نہیں، ظرف تنگنئے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت، مرے بیاں کے لیے (غالب)

اس لیے کہ ایک تو ان تک آتے آتے غزل تنگنوں سے نکل آئی تھی۔ پھر انھوں نے خود بھی اس میں اتنی وسعتیں تو بھر دی تھیں کہ جو کچھ بھی انھیں کہنا تھا وہ کہہ سکتے تھے حتیٰ کہ وہ تو یوں بھی سوچنے لگے تھے :

• یار کبھی کبھی تو چاند بھی مجھے پایز کا ایک پرت نظر آتا ہے۔ میں دھیان کی انگلیوں سے ہاتوں اس کے پرت اتار تا رہا۔ لیکن یہ چاندی کا پایز ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی پایز

کی گٹھی کو دیکھ کر یوں گمان گزرتا ہے جیسے چاند اتر آیا۔ غزل گوئی میں خرابی یہی ہے کہ وہاں پایہ کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے یہ کام اب کرنا ہی پڑے گا۔ توجہ صورت حال یہ ہو کہ پایہ تک کو غزل میں سجانے کی خواہش اور ارادہ ہو تو پھر بھلا نظیر اکبر آبادی بنا ضروری ہے ویسے ناصر نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ شروع میں تو وہ میر تقی میر کی طرز پر شہر آشوب اور عالم خواب میں ”رسالہ عالمگیر“ خاص نمبر ۱۹۴۹ء جزوی۔ جزوی) لکھیں۔ پھر جدید اردو نظم میں بھی تجربے کے لیکن حق بات یہ ہے کہ ان کی غزل ان کی نظم سے کہیں زیادہ آگے ہے۔ بلکہ ان کی غزل میں اتنی بہت سی قوت ہے کہ وہ ان کی نظموں کو سامنے ہی نہیں آنے دیتی۔ یوں بھی ان کی سبھی نظموں میں سے جو میری نظر سے گزریں، کوئی ایک نظم بھی ایک حسین اور مکمل نظم نہیں کہلا سکتی۔ ان لفظوں کے بعض ٹکڑے بے شک قابل داد ہیں لیکن ان کی نظمیں خود اپنے قدموں پر کھڑی رہ ہی نہیں سکتیں۔ انہیں سہارے دینا پڑے ہیں۔ ہاں ان کی کچھ غزلیں ایسی ہیں جو ایک نظم کی سی وحدت تاثر لیے ہوئے ہیں۔ ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ شاعری کی صنف نظم کے ارتقاء کو آگے بڑھانے یا کم از کم اس کا ساتھ دینے میں ان کا حصہ نہیں بنتا۔ ہاں غزل کے تو قوی وہ اپنے دور کے بادشاہ بھی رہ چکے ہیں، خضر بھی اور سجا بھی۔ یوں بھی ناصر کی نظموں میں غزل کے اشعار اور خوبصورت مصرعے شامل ہیں۔ ہر صنف سخن اپنے کچھ تقاضے رکھتی ہے اور صنف نظم کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔

• اختر الایمان..... نظم کی بنیادی صفت اس کا تعمیری پہلو ہے۔ ہر نظم اپنی جگہ پر ایک عمارت ہوتی ہے۔ جس طرح کسی عمارت میں ایک اینٹ اپنی جگہ پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس طرح نظم کا ایک مصرع یا ایک شعر اپنی جگہ پر ٹھیک سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، البتہ مبہم سا انپریشن ہوتا ہے جو سب سے پہلے تناظر کے ذہن میں ایک مصرع یا ایک شعر کی شکل میں آتا ہے۔ بقیہ نظم دراصل اس کی تشریح کے لیے یا اس کا پس منظر تیار کرنے کے لیے کہی جاتی ہے.....

”غیب الرحمن نظم میں ابتدایا اٹھان، کلامکس اور پھر مجموعی تاثر کا خیال رکھنا چاہیے

ہمارے یہاں Images غزل میں بھی ہوتی ہیں، لیکن نظم میں اس کے استعمال میں سلیقے کی ضرورت ہے، کیونکہ جلد از جلد ایسے بدلنے سے نظم کے تاثر پر اثر پڑتا ہے

”آل احمد سرور پیکر کی تخلیق بھی شاعرانہ عمل ہے۔ کسی روح کو جب تک پکیر میں

نہ ڈھالا جائے گا شاعرانہ عمل مکمل ہی نہ ہوگا، اور نہ شاعر اس وقت تک خالق کہا جاسکتا ہے۔ اردو

میں حالی سے پہلے بھی نظمیں لکھی گئیں، لیکن عرصے تک ہماری نظم پر بھی غزل کا سایہ رہا ہے اس کے

اثرات اب بھی باقی ہیں غزل کا مزاج رکھنے والوں کے یہاں مسلسل پرواز نہیں ملتی۔ وہ

ایک مخصوص طرز فکر کے ٹوگر ہو جاتے ہیں۔ مرثوٹا اور مسلسل فکر کے بجائے اجزاء کے حُسن پر فریفتہ

ہوتے ہیں مسلسل روشنی کے لیے مسلسل پرواز کی ضرورت ہے، پرواز یا بصیرت کی ضرورت

ہے۔ ہلکی سی کسک یا ہلکی سی لہر کافی نہیں۔ نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے، جس میں طرح طرح کے نشیب و فراز

نہیں۔ وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن

دریا میں ایک تسلسل اور ایک وحدت ہوتی ہے“

”خورشید الاسلام زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات

کو پیش کرنے کے عام طور پر تین طریقے ہیں۔ پہلا، ردِ عمل کی پیش کش۔ اسے غزل کہتے ہیں۔ محسوسات

کو ایما ناری، تازگی، اختصار اور ایجاز کے ساتھ پیش کرنا۔ ذاتی ردِ عمل، ذاتی بصیرت اور ذاتی

تجربے کے انکشاف میں کم سے کم تفصیلات کی ضرورت ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو ڈراما میں ہوتا

ہے۔ اس میں زندگی کی کش مکش ہوتی ہے۔ اقدار کا تصادم، خیر و شر یا حُسن و قبح کا معرکہ ہوتا ہے

اس کی پیش کش میں ذاتی ردِ عمل کافی نہیں۔ سبیل یا کرداروں کے ذریعے، بے لوثی، مصروفیت اور بے تعلقی

کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ تیسرا طریقہ ناول کا ہے۔ ناول نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماحول کی

تفصیلات و جزئیات بیان کر کے مصوری سے بھی کام لے اور عمل کو بھی جگہ دے۔ نظم میں یہ تینوں

باتیں ممکن ہیں۔ ذاتی ردِ عمل کا انکشاف، محض عمل کے ذریعے اور بے لوثی کے ساتھ یا عمل اور بیان دونوں

کے ساتھ تجربے پیش کرنا نظم میں ممکن ہو سکتا ہے۔“

’مجنوں گورکھپوری..... نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہوگی جس میں بالیدگی ہو، ابتداء، اوسط اور انتہا ہو اور ہر جز اس طرح کل میں ختم ہو جائے کہ کہیں سے جھول نہ معلوم ہو..... (نظم میں) ہر مصرعہ ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے، اور اس طرح کہ ان کی نشست یا ترتیب بھی بدلی نہ جاسکے۔ تب نظم کی تعمیر مکمل ہوگی۔ نظم کے پہلے مصرعے سے ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ جیسے ایک لپٹی ہوئی چیز کو کھولا جا رہا ہے۔ بغیر بالیدگی اور ارتقائے کے، نظم، نظم نہیں۔ پہلے شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جائے تو پہلے شعر کی یاد تو رہ جائے لیکن دوسرا شعر ذہن کو آگے بڑھائے۔“

یہ مختلف آرا نظم کی ہیئت اور تشکیل پر دی گئی ہیں۔ اب ہمیں ناصر کی نظموں کو دیکھنا ہے۔ ناصر نے بہت کم نظمیں کہی ہیں وہ بھی اپنی شاعری کے شروع زمانے میں۔ لیکن ناصر نے اپنی نظمیں اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیں۔ اس لیے یہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے کتنی نظمیں کیں بہر حال مجھے رسالوں سے اور ان کے گھر والوں سے جو نظمیں دستیاب ہو سکیں، انہیں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ناصر کے مزاج کی رومانویت ان نظموں میں بھی جھلکتی ہے۔ وہی رات کی خاموش دھندلی فضاؤں میں حرکت کرتے ہوئے پراسرار ہیولے۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے کہ پکایک پراسرار ماحول میں لے جاتی ہیں جہاں خوفناک چیزیں ہیں اور عجیب و غریب سوچیں رکھنے والے انسان۔ ان نظموں پر مشہور انگریزی رومانی شاعر کولریج کی Super Naturalism کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔

نظم میں دراصل وضاحت طلب باتوں کا بیان کیا جاتا ہے، یا ایک ہی بات کی جزئیات اور تفصیل بتائی جاتی ہیں، جبکہ ناصر تو چذالفاظ میں پورے افسانے سمودینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کشتیوں کی لاشوں پر جگھٹا ہے چیلوں کا

اس بستی سے آتی ہیں آوازیں زنجیروں کی

پھریں بھی ناصر نے کبھی کوئی بات واضح طور پر کھل کر بیان نہیں کی۔ ایک شہم سالب دلچسپ برقرار رکھا۔ یہ بات تو خیر نظم کی راہ میں حائل نہیں لیکن ناصر جو مختصر لیکن مکمل جملے کہنا پسند کرتے ہیں، ان کی عادت تو یہ تھی کہ وہ کسی سمت اشارا کر دیتے، اب پہچان اور وضاحت کا کام پڑھنے سننے والوں کے سپرد ہے۔ یوں تو پہچان کا کام بہت دلچسپ اور پُر لطف ہوتا ہے لیکن سمت کا تعین صحیح ہو تو تب غزل کے لئے ایمائیت بہت مفید ہے، جبکہ نظم کے لئے اتنی موزوں نہیں۔ اس لئے کہ بات کا فوراً ابداع ہوتا جائے گا تو تب اس کا اثر بھی ہوگا، اور بات آگے بڑھے گی۔

ناصر نے نظمیں لکھی ضرور ہیں لیکن وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکیں۔ دراصل ان میں وہ شاعر ناصر جیسا کہ نظر نہیں آتا جو غزل میں اپنے سچے تجربے اور مخلصی کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں ان کے اپنے دل سے اٹھنے والی لہروں کی موسیقی بہت کم سنائی دیتی ہے۔ پھر بھی ہمیں ناصر کی فنی شخصیت کے اس پہلو پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے کہ ان کے اس رخ پر بھی کہیں کہیں حسن اور خوبصورتی کے کوندے پک جلتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم ان کی طویل نظموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی طویل نظمیں جو اس وقت میرے تعلق سے ہیں وہ یہ ہیں ۱۔ "نشاط خواب" ۲۔ "یاسفر" ۳۔ "شہر عزیز" اور ایک منظوم ڈرامہ ۴۔ "سُر کی چھایا"۔

ان سبھی نظموں سے ناصر کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف نظموں کا خوبصورت استعمال کرتے ہیں، بلکہ کتے ہی نظموں کو نیا پن دے کر انھیں تازہ دم کرتے جاتے ہیں۔ پھر خوبصورت تشبیہیں بھی ہیں اور کہیں کہیں حسین اور نازک خیال بھی۔

"نشاط خواب" پر قدیم ماستانوں کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے شروع میں ناصر خوف کا تاثر قائم کرنے میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔

پہنچے تھے ہم بھی رات دہاں مدتوں کے بعد
رستہ تھا ہونا کفنا تھی ڈراؤنی

سناٹوں میں رات کے اٹھتے نہ تھے قدم پر دسے میں دل کا وہم بھی کرتا تھا ہزنی
 ہوتا تھا کنکروں پر گماں چشم شیر کا جب دفعۃً فلک پہ دکتی تھی ڈامنی
 کوسوں اکھڑی ہے وہ طبقہ زمین کا بجلی نے کی ہے رات جہاں کوہ افگنی
 لیکن اس خوف کا حوازا کیا ہے؟ صرف یہ کہ خواب ہے؟ لیکن شاعروں کے خوابوں کے بھی تو بڑے
 گہرے معنی ہوتے ہیں۔ خواب میں اچانک منظر بدل جاتا ہے۔

تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں اب تک ہے یاد اس کی جگا جوت چاندنی
 پتھر کا اک مکان پرستاں کہیں جسے رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی
 پھر وہ اس محل کے اندر کی تفصیل بنانے کے بعد کہتے ہیں:

کل رات اس پری کی عروس کا جشن تھا دیکھی تھی میں نے دُور سے بس اس کی روشنی
 سراپا کا بیان اس طرح ہے کہ جیسے بُت تراشا جا رہا ہو۔ اس میں زندگی کی تازگی نہیں ہے۔ اس لئے کہ:
 پلکیں دراز خط شعاعی سسی تیز تیز پتلی ہر ایک آنکھ کی بیرے کی تھی کنی
 اور آخر خواب کا انجام یہ ہوا کہ:

اُڑاڑ کے راج بنسوں نے جنگل جگا دیا گھوڑوں کی رتھ میں بیٹھ گئے جب بنا بنی
 تب شاعر خواب سے نکل آیا اور

تارا فخر کا نکلا تو ٹھنڈی ہوا چلی نیندا آگئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی

یوں "نشاط خواب" کا مطلع "اول نشاط" دینے کا باعث نہیں ہوا۔ البتہ مطلع ثانی میں یہ خصوصیت
 ہے کہ اس کا دوسرا بند ہمیں شاعر کی ذاتی افسردگیوں کی خبر دے جاتا ہے، جس سے ہم بھی متاثر ہوتے ہیں۔

انبالا ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے میں ہوں اُس لئے ہونے قریے کی روشنی

لے ساکنان خطہ لاہور دیکھنا لایا ہوں اس خوابے سے میں محل معدنی

جلتا ہوں داغ بے وطنی سے مگر کبھی روشن کرے گی نام ہر سوختہ تنی

خوش رہنے کے ہزار پہانے ہیں دہریں میرے ضمیر میں ہے مگر غم کی چپاشنی

طلحہ شتویٰ نما نظم "نیاسفر" میں سخنوروں کی داستان یوں بیان کی ہے:

اندھیروں کی نگری سے پھوٹی کرن
اٹھا محلِ وقت کا سارباں
نئے پھول نکلنے سے روپ میں
کہ اچانک:

پہاڑوں سے لاوا نکلنے لگا
اور: زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا
پہاڑوں میں میدان میں جنگل میں آگ
پرانی بہاریں تفس میں گسٹیں
پھرا نئی گردٹوں میں گھرا آسماں
ہوا ایک جنگل میں آکر گزر
پھرتا رہا اور روتا رہا
نظر آیا ملک سخن کنکری
تبا پلٹ کر جو دیکھا سماں اور تھا
نیاشور لے کر جمودی اٹھے

جگر پتھروں کا پگھلنے لگا
چمن بٹ گیا آشیاں بٹ گیا
سمندر میں خشکی میں جل تھل میں آگ
وہ انساں گئے اور وہ رسمیں گسٹیں
زمین کہن پر گرا آسماں
کسو کو نہیں یاں کسو کی خبر
بھرے شہر کی بنہد کھوتا رہا
غزل کنکری اور بھجن کنکری
کہ پردے میں فتنہ نہاں اور تھا
سخنور گئے اور نمودی اُٹھے

نہاں رازِ مطلوب و طالب رہا
ہر آواز پر میر غالب رہا

نہ چشم بصیرت نہ ذوقِ ہنر
وہ درسم اجداد سے کٹ گئے
یہاں میر و غالب کا فن کیا کرے
اُجڑتا رہا بوستانِ ادب

ہوئیں ساری اتدازِ زبرد
ہم اپنی روایات سے کٹ گئے
سخن ساز عرض سخن کیا کرے
مگر پھول کھلتے رہے زیر لب

مجھے شورِ سپرِخ وزیں لے گیا
 تصور کہیں سے کہیں لے گیا
 بدلنے لگی آسمانوں کی لے نیا سپاند اُترا سرِ برگِ بنے
 زمیں اجنبی آسماں اجنبی سفر اجنبی کارواں اجنبی
 کہیں بدلیاں گیت گاتی ہوئیں کہیں بارشیں گنگناتی ہوئیں
 کسی مدد بھری صبح کی آس میں شتر مرغ دیکے ہوئے گھاس میں

ستارے گئے ظلمتوں کو لئے
 چمکنے لگے شاخچوں پر دیے
 کھلا جنتِ صبح کا در کھلا بہ آواز اللہ اکبر کھلا
 ہوئے نغمہ زن طائرانِ چمن کہ عرصے میں اترے ہیں اہلِ سخن
 نئے دن کا سورج دکنے لگا

زمیں کا ستارہ چمکنے لگا (جولائی ۱۹۵۴ء)

(ناصر کو سرزمینِ پاکستان سے جو اچھی اُمیدیں تھیں ان کی نشاندہی مندرجہ بالا بندے ہو جاتی ہے) ان دونوں نظموں کی نسبت "شہرِ غریب" زیادہ شاعرانہ سخن لیے ہوئے ہے۔ اس میں شاعر کی معصوم و پاک خواہشوں کا ذکر ہے۔ اس میں ناصر کے دل سے اٹھتی ہوئی کسک اور دھیمی دھیمی ٹیسیں ہیں۔ شاعر محبوب اور اس کے مکاں کی تلاش میں نکلا ہے۔ اس کا "دیا سا مکان" مل بھی گیا لیکن روانے

پر دستک دینے سے پہلے اچانک شاعر نے
 جانے کیوں میں نے ہاتھ روک لیے
 اور پھر شاعر ایک خیال میں گم ہو جاتا ہے :

یہ مجھے کس خیال نے گھیرا
 چاٹنے آگئی ہو میرا
 کسی نام و ہم کی دیمک
 کسی ناگن کی ہوسن کا صدا
 دشتِ شب میں ابھر کے ڈوب گئی

تیرے دیوار و در کے سایوں پر
 بوٹا بوٹا ہے سانپ کی تصویر
 آسماں جیسے سانپ کی کُندلی
 تیرے گھر کی طرف سے میری طرف
 دھوپ سارنگ برق سی رفتار
 پھول سا پھن چراغ سی آنکھیں
 ہاں مری آستیں کا سانپ ہے یہ
 کراچانک، ایک ہی پل میں یوں ہوا غائب
 تب: کٹ گئی پھر مرے خیال کی رو

اور یہ خواب و خیال میں دیکھے ہوئے سانپ دراصل شاعر کے دشمن یعنی اس کے خوف اور دکھ میں شاعر
 ہوش میں آگیا تو اسے اپنے خواب کی تعبیر معلوم ہوئی:

ناگہاں سیٹیاں سی بجنے لگیں
 آنکھیں کھلنے لگیں دیرپوں کی
 میں تو چپ چاپ چل رہا تھا مگر
 تیری بستی میں اتنی رات گئے
 رات کا شہر پل میں جاگ اٹھا
 سانس لینے لگی خموش فضا
 شہر والوں نے جانے کیا سمجھا
 کون ہوتا بھلا یہ میرے سوا

اور یہ ہیں اس نظم کے آخری اشعار، جو اس کا حاصل ہیں۔

ارے یہ میں ہوں تیرا شہر غریب
 سوچتا ہوں کھڑا اندھیرے میں
 میرا ساتھی میرا شریک سفر
 کہاں لے آئی تو مجھے تقدیر
 تو گلی میں تو آ کے دیکھ ذرا
 تو نے دروازہ کیوں نہیں کھولا
 رہ گیا پھپھی رات کا تارا
 میں کہاں آگیا ہوں میرے خدا
 یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا

تیرا کیا کام تھا یہاں ناصر

تو بھلا اس نگر میں کیوں آیا

اس نظم کے کئی اشعار میں غزل کے اشعار کی سی خوبی ہے۔

آ رہی ہے یہ کس کے پاؤں کی چاپ پھیلتا حبار ہا ہے سناٹا

یہ دیا سا ہے کیا اندھیرے میں ہونہ ہو یہ مکان ہے تیرا

ناصر نے ایک منظوم ڈرامہ بھی لکھا جو خاصا طویل ہے۔ اس کی کہانی کشش رکھتی ہے۔ شام کا

وقت ہے۔ ریل گاڑی ایک پہاڑی علاقے میں فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی ہے۔ درمیانے درجے کے

چھوٹے سے ڈبے میں چند مسافر بیٹھے ہیں جن میں احمد، فیاض اور عبدل بھی ہیں۔ عبدل اس

ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کا گاؤں راستے میں پڑتا ہے۔ وہ سات سال بعد اپنے گاؤں لوٹ

رہا ہے۔ احمد اور فیاض عبدل کے گاؤں میں رہتے ہیں لیکن وہ دونوں عبدل سے ناواقف ہیں۔ احمد

اور فیاض آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ احمد فیاض سے پوچھتا ہے کہ کہاں جائیں گے آپ؟ فیاض کہتا

ہے "سورج پور! بس اگلے اسٹیشن سے آگے" عبدل فزا دور کرنے میں کھڑکی کی طرف بیٹھا ہے۔ وہ

سورج پور کا نام سنتے ہی چونک پڑتا ہے اور پھر کسی خیال میں کھوجاتا ہے۔ احمد کہتا ہے: ارے

پھر تو اک ساتھ اتریں گے۔ میں تو نویں شہر جاؤں گا۔ جب فیاض کہتا ہے:

فیاض = وہاں تو اپنا کاروبار ہے

پچھلے دنوں ہی بھائی نے ہوٹل کھولا ہے

اب اچھا خاصا چلنے لگا ہے

سورج پور میں اپنا گھر ہے

ادنی مسجد سے کچھ آگے وہ جو عظمت منزل ہے نا

وہی ہمارا گھر ہے۔

یہ سن کر عبدل جو کونے میں خاموشی سے بیٹھا ہے چونکتا ہے اور غور سے دیکھنے پر پہچان جاتا ہے

کہ یہ اس کے بچپن کا دوست ہے ۔

عبدال = (سوچتا ہے) یہ فیاض ہے ! عظمت منزل والوں کا وہ منجھلاڑ کا !!

یہ میرے بچپن کا ساتھی !

یہ اب کتنا بدل گیا ہے !

احمد کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاپنج گھر جس کے مالک اور حصہ دار پیٹے عبدال اور اس کا عزیزینہ دوست حسنی تھے اب وہ احمد اور اکبر کے پاس ہے ۔ احمد فیاض سے پوچھتا ہے "کیا آپ عبدال سے واقف ہیں ؟" تب عبدال احمد کو بھی جان جاتا ہے :

عبدال = (سوچتا ہے) یہ احمد ہے ! اکبر میرے دوست کا ساتھی !

کبھی کبھی یہ اکبر سے ملنے آتا تھا ۔

اکبر میرا دوست مجھے کیا بھول گیا ہے ؟

اکبر حسنی دونوں ساتھی سوچتے ہوں گے

میں اور ندی دونوں جل کر

احمد، فیاض کو نئے شہر میں بننے کو کہتا ہے تب فیاض بڑے دکھ سے ذکر کرتا ہے کہ

فیاض = سورج پوراب پھر نہ بے گاہ

آج سے سات برس پہلے جب اس جھنگل کو آگ لگی تھی

وہ دن اپنے گاؤں کی بربادی کا دن تھا "

کنویں کا ذکر ہوتا ہے تو عبدال کو اپنی محبوبہ اور اس ڈرامے کی ہیروئن، ندی سے کنویں پر ملاقات یاد آجاتی ہے ۔ اسے اپنا بچپن یاد آتا ہے ، جب وہ اور حسنی کھیل کود میں مصروف تھے کہ سورج پور کے نمبردار کا بیٹا بلھا اور اس کی بہن ندی آجاتے ہیں ۔ ندی بھائی کے منہ کرنے کے باوجود عبدال

کے پاس چلی آتی ہے اور اس سے کل پھر ملنے کا وعدہ کرتی ہے۔ بلحا سے زبردستی کھینچ لے جاتی ہے پھر عبدال کو اپنی جوانی کا زمانہ یاد آتا ہے۔ چیت کا مید یاد آتا ہے۔ میلے میں عبدال اور حسنی کے علاوہ نندی بھی ہے۔ عبدال نندی سے بات کرتا ہے مگر وہ اپنے بھائی کے ٹہ سے گھبرا جاتی ہے۔ پھر عبدال گاڈوں کی رملکیوں کو دور درخت کے پھپھے سے جھانکتا ہے۔ نندی کی سہلیاں اسے پھپٹر رہی ہیں کہ اتنے میں عبدال گھوڑے پر سوار سامنے آ جاتا ہے۔ سہلیاں ڈر کر ایک طرف بھاگ جاتی ہیں اور نندی اکیلی رہ جاتی ہے:

عبدال = آؤ میں تم کو گھر چھوڑ آؤں

دیکھو! سورج کتنا نیچے اتر گیا ہے؟

نندی = (ذرا گھبرا کر) نہیں جی! چلے جاؤ

عبدال = ٹھہرو نندی!

نندی = امی کہتی تھیں غیر آدمی سے منہں بات کرتے۔

تب عبدال نندی کو بچھلی اکٹھی گزاری ہوئی گھڑیاں یاد دلاتا ہے اور نندی اس کی باتیں سنتی ہے:

عبدال = تم کیا سوچ رہی ہو؟

نندی = نہیں کچھ نہیں! باڈولی ہو گئی ہوں

عبدال = سوچ رہا ہوں ہم یوں کب تک

ہم یوں کب تک..... تم ہی سوچو!..... ہم یوں کب تک!

نندی = چلو اب یہاں سے چلیں۔

عبدال پھر یادوں کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ اتنے میں ریلی گاڑی آتی ہے پھر نندی خود فرود

ہو جاتی ہے۔

نندی = دیکھو وہ کیا شے جھلک مارتی ہے ؟

وہ گھوڑے پہ کون آ رہا ہے ؟

عبدل = اکبر! اکبر اپنا دوست ہے نندی!

(اکبران دونوں کے قریب آ کر گھوڑا زدک لیتا ہے)

اکبر = سلام بھیا! مزے میں ہو، خوب کٹ رہی ہے!

ٹوگے ڈیرے میں!

رات کو تم ضرور آنا (اکبر چلنے لگتا ہے)

عبدل = اکبر بھیا! ٹھہرو اکبر! بات تو سنتے جاؤ

حسنی کہیں ملے تو کہنا رات کو ڈیرے میں آ جائے

اکبر = میں کنج گھر جا رہا ہوں عبدل

تمہارا پیغام بھیج دوں گا!

بڑی اندھیری ہے آج کی شام

اندھی آٹے گی! (اکبر گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہوا ہوا جاتا ہے)

عبدل = اکبر بھی کیا سوچتا ہوگا؟

حسنی نے بھی کئی دنوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے

نندی = ادھر گردسی اڑ رہی ہے

عبدل = (لاپرواہی سے) ریت اڑی ہے، کچھ بھی نہیں ہے

نندی = زیادہ خوف زدہ آواز میں، نہیں وہ ادھر آ رہے ہیں!

چلو اس بنی کے درختوں میں چھپ جائیں!

رات ہو گئی ہے! (نندی اٹھ کر دوڑنے لگتی ہے)

لیکن عبدل کو اس کے اندر کی آواز اپنی جان بچانے کا مشورہ دیتی ہے اور کہتی ہے "نندی اب نہ ملے"

گی۔۔۔۔۔ اب آواز نہ دینا عبدل۔ نندی اب آواز نہ دے گی۔ آگ ہے اندھی۔ آگ ہے
عبدل = (اٹھ جاتا ہے اور نندی کے پیچھے بھاگتا ہے)

ڈرو نہیں میں ساتھ ہوں نندی!

اس تالاب کے پھل کے نزدیک نہ جانا۔

ٹھہرو نندی میں بھی آیا

اندھیرے جنگل میں عبدل نندی کو ڈھونڈتا ہے لیکن نندی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

عبدل تھک کر ایک گھنے درخت کے تنے کے سہارے پیران کھڑا ہو جاتا ہے۔ خاص رات ہو گئی

ہے۔ وہ نندی کے خیال میں کھو جاتا ہے۔

عبدل = ٹھہرو نندی!

ٹھہرو نندی کہاں چلی ہو؟

رستہ بھول نہ جانا!

اتنے میں لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے اور وہ جنگل کو آگ لگا دیتے ہیں۔

عبدل = کم بختوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

کیسے بھاگوں؟

آگ۔ آگ۔ آگ

چاروں جانب آگ کا دریا

کہاں ہونٹدی؟

بولو نندی کہاں چھپی ہو!

باہر جاؤں! —

لیکن نندی!!

نندی مہربانے گی عبدل!

بہری اپنی جان بچالے عبدال ! وہ رستہ ہے اور عبدال واقعی بھاگ جاتا ہے۔ گھر پہنچتا ہے تو ماں باپ سے اور نندی کو کوس بھی رہے ہیں ! اور ماں عبدال کے لئے فکر مند بھی ہے۔ آخر اپنے اندر کی آواز کے دوبارہ سمجھانے پر عبدال یہاں سے بھی بھاگ جاتا ہے۔

عبدال سوچوں سے لوٹ آتا ہے۔ ریل سٹورج پور سے نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ احمد اور فیاض باتوں میں مصروف ہیں۔ باتوں باتوں میں اکبر کی فیشن ایبل بیوی مونا کا ذکر آتا ہے تو احمد کہتا ہے :

احمد = اجی اب تو نقشہ ہی کچھ اور ہے

وہ زمانہ گیا یہ نئی روشنی ہے

وہ نندی بھی تھی ! آگ میں جل بھی

تو وہ آگ کس نے لگائی تھی۔

عبدال نے ! نندی کے بھائی نے ! حسنی نے !

تعجب ہے عبدال کہاں تھا ؟

وہ نندی تو جل ہی گئی تھی

تمہیں تو خبر ہے !

فیاض ! آگ کے بہتے دریاؤں میں

اس کی چیخیں ہم نے سنی ہیں

ہم نے لاکھ پکارا — آوازیں دیں

لیکن کوئی نہ بولا۔

اس کے بعد احمد اس بات کو یاد کرتا ہے کہ کس طرح وہ حسنی اور بند و مرحوموں کے کھیت میں بیٹھے تھے

اور حسنی گیت سار ہاتھا کہ اکبر آتا ہے۔ بندو اس سے عبدل کا حال پوچھتا ہے۔ وہ بتاتا ہے۔ پھر سب مختلف باتوں میں کافی دیر مصروف رہتے ہیں کہ بندو چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے :

بندو : دیکھ تو حسنی !

یو کیسی ہے پگھم گئی !

بارہ سوار سامنے سے گرد اڑتے ہوئے آتے ہیں۔ ان میں بلہا بھی ہے جو تینچ رہا ہے دوڑیو لے ! دوڑیو ! بندو کے پوچھنے پر ایک سوار کہتا ہے کہ عبدل نندی کو بھگالے گیا ہے اور پھر سب گھوڑے آگے بھگالے جاتے ہیں۔ یہ سب دوست سکتے میں آجاتے ہیں۔ آخر حسنی احمد کو ساتھ لیے عبدل کے پیچھے جاتا ہے۔ احمد واپس جانا چاہتا ہے لیکن حسنی تلاش جاری رکھتا ہے۔ آخر وہ نندی پار کر کے جنگل کے خوبصورت حصے میں آجاتے ہیں۔ اچانک ان کے گھوڑے رک جاتے ہیں۔ احمد پھر بہت اصرار کرتا ہے لیکن حسنی واپس جانے سے انکار کر دیتا ہے کہ اچانک :

احمد : ارے وہ ادھر آگ !

اس آگ کے پاس ایک آدمی زاد

حسنی اور احمد ڈرتے ڈرتے گھوڑوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ الاؤ کے قریب آجاتے ہیں حسنی آگے ہے۔

دیکھتے ہیں تو احمد :- پاس پیچھے تو دیکھا الاؤ پہ اک نار بیٹھی تھی

جلتے الاؤ کے نزدیک عریاں بدن ایک عورت

پریشان بالوں سے منہ کو چھپائے

خدا جلنے وہ کون تھی !

ہم نے پوچھا تو کھانے کو دوڑی

ڈرانے لگی اور کہنے لگی "ڈاین ہوں - دور ہو جاؤ ورنہ کلیجہ چپالوں گی۔"

پہلے تو ہم ڈر گئے پھر ذرا بڑھ کے حسنی نے نیزہ سنبھالا۔

وہ تھرا گئی زرد سی پڑ گئی۔

انحر حسنی کے یہ بتانے پر کہ وہ گیت سنا تا ہے اس ناری نے گیت کی فرمائش کی۔ وہ سنا رہا ہے کہ
احمد: ارے آگ!

یہ آگ! — یہ شور

گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازوں اور لوگوں کے شور سے جنگل گونج اٹھتا ہے۔ جنگل کے ایک طرف
آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے ہیں۔ عورت جنگل کی طرف ہی بھاگ جاتی ہے اور حسنی اس کے
پچھے بھاگتا ہے۔

رات گہری ہو گئی۔ چاروں طرف سے جنگل دھڑ دھڑ جلتا ہے۔ ایک عجب بھگدڑ مچی ہے۔
مختلف آوازیں آتی ہیں۔

آوازیں: ۱ — وہ ادھر بھاگا!

ارے پکڑو اسے! جانے نہ پائے۔

۲ — بڑا اندھیرا ہے میرے یارو

بستے گاؤں کی بیٹی کا ڈکے لے گیا حسنی

۳ — منے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ واحسنی تھا

حسنی ہو رندی دونوں تھے

انحر حسنی پکڑا جاتا ہے۔ جرم اسے مارنے پر تل جاتا ہے۔ احمد اور کینخ گھر کا میجر روکتے رہ جاتے
ہیں۔ کہتے ہیں پولیس کے حوالے کر دو۔ اپنے ہاتھوں میں قانون لینا حماقت ہے۔ کوئی نہیں
مانتا۔ بلھا کہتا ہے،

بلھا: یو میرا مجرم ہے یارو

ان لوں میرے پاس یاؤ

حسنی اپنے بے گناہ ہونے کا کہتا ہے لیکن بلحا نہیں مانتا اور کہتا ہے تو پیلے اپنا وار کر پھر روک میرے وار کو۔ اور آخر دونوں میں لڑائی ہو جاتی ہے۔ احمد یہ سب کچھ تفصیل سے فیاض کو بتا رہا ہے۔ گاڑی اڑی جا رہی ہے۔ رات اور گہری ہو گئی۔ احمد جب اس عورت کا ذکر کرتا ہے جو آگ کے پاس بیٹھی تھی تو عبدال بھی یہ باتیں سن رہا ہے اور اس کا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا ہے اسے آج کئی باتوں کا علم ہو رہا ہے، مثلاً، یہ کہ اس کے ماں باپ سیلاب میں مر گئے۔ اور حسنی نے کیا کچھ کیا۔ حسنی اور نسندی پر کیا بیتی۔

احمد: پھر کیا ہوا یہ نہ پوچھو

وہ ناری خدا جلنے غائب ہوئی، جل بجھی، بھاگ نکلی

خدا جانتا ہے

فیاض: وہ بزدل پھر گاؤں چھوڑ کے کیوں بھاگا تھا؟

احمد: کوئی کہتا ہے عبدال وہیں جل گیا

کوئی کہتا ہے یہ جھوٹ ہے وہ کسی دوسرے گاؤں میں تھا

مگر یہ مجھے علم ہے یا خدا جانتا ہے

کہ حسنی مرے ساتھ تھا

وہ تو ناحق ہی مارا گیا

میں نے لوگوں کو روکا بڑی منتیں کیں

بلھا تو غصے میں اندھا تھا

بس دونوں لڑنے لگے اور وہیں کٹ مرے

عبدال سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیال اسے آوازیں دیتے ہیں۔ سورج پورا اب

بالکل نزدیک آگیا ہے۔ عبدال جسے سورج پورا اترنا تھا اسے اس کی سوچیں

کہ رہی ہیں:

تب یہ آواز سے کہتی ہے کہ وہ نندی، حسنی، اپنے ماں باپ اور بلھے کا قاتل ہے۔ عدل
اپنی سوچ کی یہ آوازیں سن کر گھبرا جاتا ہے۔
آواز: سورج پورا تر و گے عدل

وہاں نہ جانا

وہاں ترا اب کوئی نہیں ہے

عدل: تو جھوٹا ہے

نندی اپنی موت مری ہے

حسنی میرا جگری دوست تھا

آواز: تو بزدل ہے!

تو نے سورج پور کو اجاڑا

تب اچانک کہانی یوں ختم ہوتی ہے:-

احمد: ارے کیا ہوا دیکھنا تو

یہ گاڑی کھڑی ہوئی؟ ریاض عدل کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور اسے پہلی بار مخاطب کرتا ہے

فیاض: کون سا اسٹیشن ہے بھائی؟

آپ یہاں آ رہے کئے صاحب؟

احمد: نہیں! یہ تو جنگل ہے

گاڑی یہاں کیوں رکی

کوئی آواز بھی تو نہیں

کوئی بتی نہیں!

یہ تو جنگل ہے سنان جنگل

ادویں یہ کہانی اختتام تک اگر حسب معمول گہری دھند کے چھپے چھپ جاتی ہے۔ یہی نامہ کرتے

ہیں کا انجام کو واضح نہیں کرتے۔ ناصر اس کہانی میں کلائمکس سپید کرنے میں تو ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ پینظوم ڈرامہ سیدھے سادے انداز میں، صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ کرداروں کی انفرادیت بھی جھلکتی ہے۔ اس ڈرامے میں خامیاں بھی ہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے اس پر ناصر نے بہت محنت کی تھی۔ کہانی کے پیچ پیچ میں ہی اس کے انجام کی پیش گوئی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب عبدل ندی کو بتاتا ہے کہ بچپن میں ہم فاختہ کو تنگ کرتے تھے تو:

ندی، (گھبرا کر) امی کہتی تھیں یہ ایک مقدس پرندہ ہے
اس کو نہیں مارتے

اک دن میرے بھیا کو امی نے مارا تھا

وہ فاختہ مار لایا تھا۔

یا جب اکبر کہتا ہے — ” بڑی اندھیری ہے آج کی شام — آندھی آئے گی“
اس ڈرامے میں ناصر کی منظر نگاری کی ایک جھلک دیکھیے۔

” وہ دیکھو! — وہ رنگ برنگے ذرے

بھورے بھورے نیلے نیلے پتھر!

ریت کے تارے آگ کی ہولی کھیل رہے ہیں

پیلی کر نیں کیکر کی سیڑھی سے اتر رہی ہیں۔

ہوا کتنی خاموش ہے

فاختہ ریت کے نرم بستر پہ چپ چاپ بیٹھی ہے

ندی ہے، ندی کا پانی ہے، پانی کی آواز ہے

فاختہ بہتے پانی کے شیشے میں اپنے ہی روپک کو تکتی ہے“

یہ تو بڑی طویل نظمیں۔ اب مختصر نظموں کی طرف آئیں۔ سب سے پہلے تو ہم ناصر کی وہ

نظمیں دیکھیں جو انھوں نے ترجمہ کیں۔ یہ ہیں صینی نظمیں۔

۱۔ چائے و نائٹی — "جاڑے کی رات"

۲۔ وی۔ تی — "پی، فو، جن"

۳۔ تزمے۔ یے۔ "گیت"

(رسالہ "سویرا" ۱۷-۱۸)

اور یہ ہیں مغربی امریکہ کے گوالوں کے گیت

۴۔ سام ساس

۵۔ خدا حافظ، بوڑھے پنیت

۶۔ جو پی ٹی ہی یو، — آگے بڑھو میرے بچھڑو

۷۔ پرانے "چس ہوم" کا سفر

۸۔ خون آلودہ زمین (امریکی سوسائٹی۔ ترجمہ ناصر کاظمی۔ اردو مرکز لاہور)

ان کا ترجمہ ناصر نے خاصی خوبصورتی سے کیا۔ ان کی اہم بات یہی ہے کہ ترجمہ کر کے ناصر نے

انہیں پاکستانی نظمیں بنانے کی سعی کی ہے اور یہ اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے الفاظ کا استعمال ہی اس سلیقے سے کیا ہے۔ اب مثلاً یہ نظم دیکھیے۔

پی، فو، جن

اس کے ریشمی پھرن کی سرسراب خاموش ہے

مرمر کی پگ ڈنڈی دھول سے اٹی ہوئی ہے

اس کا خالی کمرہ کتنا ٹھنڈا اور سونا ہے؟

دروازوں پر گرے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگے ہیں

اس سندری کے دھیان میں بیٹھے

میں اپنے دکھیارے من کی کیسے دھیر بندھاؤں

اب پرانے جس ہوم کا سفر "نظم کا ایک اقتباس دیکھیے
 " میں اپنے مالک کے پاس معاوضہ لینے کے لئے گیا
 اس نے پہلے ہی حساب لگا رکھا تھا کہ میرے نوڈا رہتے ہیں۔
 اب میں جلد سے جلد اپنا ساز و سامان بیچ دوں گا۔
 اب میں کسی کمبخت کے لئے مویشیوں کا ریوڑ نہیں ہانکوں گا
 اب میں اپنے گھوڑے کی زین پر مزے سے بیٹھ جاؤں گا اور آزادی کا سانس لوں گا
 آئندہ میں گایوں کے ریوڑ کبھی نہیں لے جاؤں گا
 اے میرے ریوڑ کے مالک خدا حافظ! میں تمہیں کوئی بددعا نہیں دیتا
 اس کام کو خیر باد کہہ کر اب میں کھیتی باڑی شروع کروں گا۔"
 اور اب یہ ہیں ناصر کی اپنی مختصر نظمیں۔ ان پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ ساتواں رنگ

بال کالے ، سفید برف سے گال
 چاند سا جسم ، کوٹ بادل کا
 لہریا آستین ، سُرخ بٹن
 کچھ بھلا سا تھا رنگ آنچل کا
 اب کے آئے تو یہ ارادہ ہے
 دونوں آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا

(رسالہ سویرا، ۱۹۔۲۰۔۲۱)

پہلے چار مصرعوں تک یوں لگتا ہے کہ ایک تصویر میں رنگ بھرے جا رہے ہیں اور یہ ابھی مکمل
 ہوا چاہتی ہے کہ اگلے دو مصرعے ساری تصویر پر ہی پردہ ڈال دیتے ہیں۔ غالباً مطلب یہ ہے کہ
 حُسن کے محسوسے کو جی بھر کر دیکھوں گا۔ لیکن بات کا ابلاغ ہو گا تو تب اثر بھی ہو گا۔ آخر دونوں

آنکھوں سے دیکھنے سے کیا ہوگا؟

۲۔ گجر پھولوں کے

اک کرن چشم و چراغِ دلِ شب
کیوں اسے خونِ رگِ دل نہ کہوں
رقص کرتی ہے کبھی شیشوں پر
کبھی روزن سے اتر آتی ہے
کبھی اک جامہ آویزاں کی
زم سلوٹ کے خشک گوشوں میں
گیت بنتی ہے گجر پھولوں کے

(رسالہ "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱)

پھر وہی چیز — بات شروع تو بہت خوبصورتی سے ہوئی تھی لیکن اچھا تو پھر کیا ہے۔ پھر کیا ہوا؟ کا سوال یونہی نضا میں تیرتا رہ گیا اور یہ سوال کوئی تعمیری پہلو لیے نہیں آتا، کیونکہ جواب میں خاموشی ملتی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے نظم کو کچھ بھی نہیں دیا۔ ان کے ترانوں اور ملی نغموں کی مقبولیت اب بھی برقرار ہے پھر قابلِ قدر نعتیہ نظمیں بھی ہیں۔ اصل میں ان کی وہ نظمیں جو غزل کی طرز پر ہیں یا وہ غزلیں جو نظم کہلانے جلنے کی مستحق ہیں، وہ ایک اچھی خوبصورت اور مکمل نظم کا تاثر دیتی ہیں۔ مثلاً یہ نظم دیکھیے جو رسالہ "سویرا" میں تو انھوں نے — "درختوں میں" کے عنوان سے چھپوائی لیکن "دیوان" میں اسے خود ہی غزل قرار دے کر شامل کر لیا۔

درختوں میں

گا رہا تھا کوئی درختوں میں رات نیند آگئی درختوں میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے آگ سی لگ گئی درختوں میں
 مینہ جو برسا تو برگ ریزوں نے چھیڑ دی بانسری درختوں میں
 کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دور جلکے دیکھو کبھی درختوں میں
 (دیوان ص ۸۴)

”نظم آخر تک پڑھ جائیے، آپ بھول ہی جائیں گے کہ اس پر ”غزل“ کا عنوان نہیں ہے۔ میں
 یہاں کچھ ایسی غزلوں کا ذکر کرتی ہوں جنہیں نظم بھی کہہ دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا مثلاً ”برگنے“
 کی یہ غزل کیا نظم نہیں ہے؟ حتیٰ کہ ایک نظم کی طرح سے اس کے پہلے دو مصرعے آخر میں پھر
 دوہرائے گئے ہیں یوں ایک تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ شاعر خدا سے شکوہ کر رہا
 ہے اور اسے اسی کی دنیا دکھا رہا ہے یوں تو ناظر زمیوں کا شاعر ہے لیکن یہاں ایک ایسی دہلی
 دہلی چٹخ کے اچانک بلند ہونے کا احساس ہوتا ہے جو دنیا والوں کے ظلم کے خلاف احتجاج کی
 حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بغاوت نہیں ہے بلکہ صرف احتجاج ہے۔

او میرے مصروف خدا اپنی دنیا دیکھ ذرا
 اتنی خلقت کے ہوتے شہروں میں ہے ساٹھا
 جھونپڑی والوں کی تقدیر بچھا بچھا سا اک دیا
 خاک اڑاتے ہیں دن رات میلوں پھیل گئے صحرا
 زاغ و زغن کی چیخوں سے سونا جنگل گونج اٹھا
 سورج سر پر آ پہنچا گرمی ہے یا روزِ جزا
 پیاسی دھرتی جلتی ہے سوکھ گئے بہنے دریا
 فصیلیں جل کر راکھ ہوئیں نگر نگر کال پڑا
 او میرے مصروف خدا اپنی دنیا دیکھ ذرا

شہر در شہر گھر جلائے گئے
 یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
 اک طرف بھوم کر بہار آئی
 اک طرف آشیاں جلائے گئے
 اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
 اک طرف جشنِ جم منائے گئے
 کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
 عصمتوں کے دیئے بچھائے گئے
 آہ وہ غلوتوں کے سرمائے
 مجمعِ عام میں ٹائے گئے
 وقت کے ساتھ ہم بھی لے نافر
 غار و خس کی طرح بہائے گئے (برگینے ص ۱۲۵)

اب مندرجہ ذیل غزل دیکھیے۔ بیشک یہ ایک مسلسل غزل ہے لیکن کیا یہ ۱۹۴۷ء کے بعد لکھی جانے والی ترقی پسندوں کی نظم سے بہت مختلف ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں بھی وہی انسانیت کی تباہی پر دکھ اور غم کا اظہار ہے۔ بے شک یہ نقادوں کے بتائے ہوئے نظم کے اس تقاضے کو پورا نہیں کرتی کہ اس میں سے ایک شعر بھی نکال دیا جائے تو نظم کی وحدت میں فرق آجاتا ہے، لیکن ایسا تو ہے کہ پوری نظم پڑھ کر صرف ایک ہی صورتِ حال کے مختلف رخ سامنے آکر ایک مجموعی تاثر قائم کرتے ہیں۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اختتام کو الجھا نہیں دیتی بلکہ اپنی تکمیل کرتی ہے۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ یہاں آخری شعر ایک فل شاپ کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ ہے مندرجہ بالا صورتِ حال کا انجام۔ اس کا تسلسل اسی طرح کی ایک اور غزل سے (جو ”دیوان“ میں شامل ہے) جاملتا ہے۔ جو

یوں شروع ہو کر ۔

سناتا ہے کوئی بھولی کہانی
ہکتے بیٹھے دریاؤں کا پانی
سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی
اس طرح ختم ہوتی ہے :

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی (دیوان ص ۱۸)
اب جو غزل آئے گی اس کا عنوان ہونا چاہیے تھا "بنت آگئی"

کنج کنج نغمہ زن بسنت آگئی
اڑ رہے ہیں شہر میں تنگ رنگ رنگ
موجہ بے بھانے والے پیارے پیارے لوگ
سبز کھیتوں پہ پھر نکھار آگیا
اب سبھی کی انجمن بسنت آگئی
جگمگا اٹھا گگن بسنت آگئی
دیکھنا چمن چمن بسنت آگئی
لے کے زرد پیرہن بسنت آگئی

پچھلے سال کے ملال دل سے مٹ گئے

لے کے پھر نئی چھین بسنت آگئی

اور یہ ہے "کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ" کہنے والے گرجتے ہوئے اقبال کے برابر
برابر ناصر کی نرم مگر گونجیلی آواز :

چند گھرانوں نے بل جُل کر
باہر کی مٹی کے بدلے
سب کا بوجھ اٹھانے والے
بیلی چادر اڑھنے والے
کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
گھر کا سونا بیچ دیا ہے
تو اس دنیا میں تنہا ہے
تیرے پاؤں تلے سونا ہے

گہری نیند سے جاگو ناصر

وہ دیکھو سورج نکلا ہے (دیوان ص ۱۲۳)

اس سلسلے کی اب آخری غزل یعنی "نظم" دیکھیے۔ یہ دیوان سے لی گئی ہے اور دیوان کی کئی ایسی غزلیں اسی طرح کا تسلسلے لیے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ناصرخونجی شروع کی نظمیں تو صرف تجربہ تھیں، جبکہ یہ نظمیں اس خود بخود اٹھنے والے جذبوں کے تحت کہیں جو بات کا واضح طور پر اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ جو اردگرد کی جاگتی شور مچاتی زندگی کو دیکھ کر اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اب مافوق الفطرت پر اسراریت نہیں ہے بلکہ حقائق کا بیان ہے :

وہ ساحلوں پہ گانے دلے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں مرے ادھر ادھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے

وہ دل میں کھینے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکانے والے کیا ہوئے

عمارتیں تو جبل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

ناصر نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ترانے بھی لکھے۔ ۶۵ء کی جنگ میں اپنا ایک ترانہ ریڈیو پاکستان میں ریکارڈ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ زندہ دلوں کا گہوارہ ہے۔ سرگودھا میرا شہر۔ میرا شہر۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ ترانہ تو ہے عزیز ملت تو ہے نشانِ حیدر اور میانکوٹ تو زندہ رہے گا۔ انہوں نے سرزمینِ پاکستان سے ہمیشہ کی نشاندہی کی ہے۔

کھلا جنتِ صبح کا در کھلا با آوازِ اللہ اکبر کھلا
ہوئے نعمتِ زن طائمانِ چمن کہ عرصے میں اترے ہیں اہلِ سخن
نئے دن کا سورج دکھنے لگا زمین کا ستارہ چمکنے لگا

یہیں مجھے ناصر کی وہ نظم یاد آگئی جس نے نظرت کے چیلنج کے مقابلے میں حصہ لیا اور آخر اُسے شکست دے دی۔ یہ نظم گائی تھی استاد امانت علی خاں نے جو ناصر کی ہی عمر جتنے ہو کر فوت ہو گئے۔ استاد امانت نے اس نظم کو ملہار کے سُرور میں گانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے پہلے دو نفل پڑھے اور پھر گیت گانے اسٹوڈیو میں چلے گئے اور جب وہ گارہے تھے تو باہر بارش شروع ہو چکی تھی جس کا عرصے سے انتظار تھا۔ یہ واقعہ مدتوں لاہور میں گھومتا پھرا۔ نظم یہ تھی :-

بارش کی دعا

اے دانا بادل برسا دے
فصلوں کے پرچم لہرائے
دیس کی دولت دیس کے پارے
سوکھ رہے ہیں کھیت ہمارے

ان کھیتوں کی پیاس بجھا دے
اے دانا بادل برسا دے

یوں برسیں رحمت کی گھٹائیں
داغ پرانے سب دھل جائیں

اب کے برس وہ رنگِ جمادے

اے داتا بادل برسا دے

کھیتوں کو دانوں سے بھر دے

مردہ زمیں کو زندہ کر دے

کیاری کیاری پھول کھلا دے

اے داتا بادل برسا دے

تو سنا ہے سب کی دعائیں

داتا ہم کیوں خالی جائیں

ہم کو بھی محنت کا صلا دے

اے داتا بادل برسا دے (۲ - فروری ۱۹۶۷ء)

ناصر کاظمی کی نظموں کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر خود سراسر غزل تھے اور اگر وہ غزل کی طرز پر (اقبال کی طرح) نظمیں کہتے تو نظموں کی کامیابی یقینی تھی لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ایک بہترین غزل گو کو لازمی طور پر نظم نگار کا لبادہ بھی پہنا دیا جائے؟ ناصر نے غزل کہی اور بہت عمدہ غزل کہی نظم میں تجربہ کیا لیکن کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ بعد میں یہی نظم گوئی کا جذبہ "پہلی بارش" کی مسلسل غزلوں میں اپنا اظہار کر گیا۔ ان ۲۴ غزلوں کو اگر ایک تسلسل میں دیکھیں تو انسانی زندگی کے طویل سفر کے سبب میل دکھائی دے جائیں گے۔

(ب) نثر

ناصر کی نظموں میں اُداسی تو نمایاں ہے ہی لیکن اس میں ڈرا دینے والی پراسراریت کا عنصر

بھی شامل ہو گیا ہے۔ یوں پڑھنے والا اپنے آپ کو ایک گھٹی گھٹی، اداس اداس فضا میں سمجھے سمجھے
 قدم اٹھاتا محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی نثر بہت شگفتہ ہے جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ
 ناصر گہری گہری سنجیدہ باتیں سوچنے کے علاوہ بننا بھی کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی نثر
 لطیفوں اور چٹکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ نثر سنجیدہ موضوعات پر تو ہے لیکن اس کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا
 ہے جیسے باغوں میں کھلے تازہ تازہ گلہوں کی ہلکے ہلکے اڑی چلی آرہی ہے۔ یہ نثر کبھی بھی کوئی ٹھوس
 تحقیقی مقالے معلوم نہیں ہوتی بلکہ یہ گفتگو ہے، اپنے آپ سے ک جانے والی نہیں بلکہ محفل میں موجود
 ہونے کے احساس کے تحت کی جانے والی گفتگو۔ کیسی پر معنی اور خوبصورت گفتگو ہے۔ عام طور پر
 کی جانے والی باتوں سے الگ تھلک ایک منفرد انداز لیے ہوئے۔ یہ تو طے ہے ہی کہ ناصر نے
 شاعری اور زندگی کو ایک کر رکھا تھا۔ پھر ناصر کی گفتگو اتنی اور سچل اور اتنی تخلیقی تھی کہ.....
 میراجی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں نہیں
 کر رہا ہے، بلکہ آواز میں شعر سوچ رہا ہے اور اس کی گفتگو ہمیشہ شعر و ادب کے بارے میں ہوتی
 تھی اور اشعار کے حقیقی مفہوم کو اجاگر کرنے کے لئے وہ زبان و بیان اور جذبہ و خیال کے بے شمار نکات
 کھوتے چلا جاتا تھا۔ یہ "بلند آواز میں شعر سوچنے" کی سی کیفیت ان کی نثر میں بھی ہے اور اسی
 لیے تو ناصر کی نثر نیا اور الگ سا اسلوب رکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نثر سے شاعری کو ذرا دور دور
 رکھنا چاہیے۔ لیکن ناصر کے ہاں شاعری نثر میں اس خوبصورتی سے سمائی ہے کہ اگر اسے نکال دیں
 تو ناصر کا اسلوب نثر ہی ویران ہو جائے گا۔

ناصر کی نثر کی خصوصیات کو دیکھنے سے پہلے یہ جان لینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ناصر کو جس طرح
 قدیم شعراء کا کلام بے حد عزیز تھا اور خصوصاً میر سے ان کا لگاؤ اس انتہا تک پہنچ گیا تھا کہ انہوں
 نے تیر کی کلیات کے کئی جزو بنالیے تھے جن میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت ناصر کے پاس ہوتا، اسی

طرح ناصر پرانی نثر سے بھی انہماں یا بے گانہ نہ تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ناصر سلطان کاظمی نے بتایا کہ ناصر کی میز پر ہر وقت محمد حسین آزاد کی "آب حیات" رکھی رہتی۔ آزاد رجحانیت نثر نگار سے ان کی اس دوستی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد سے ان کی دلچسپی کی وجہ صرف یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ بھی اپنے پرانے زمانوں کی یادیں تازہ کئے رکھتے ہیں، بلکہ ان کی نثر میں جو خوبصورت تمثیلیں ہیں ان کی کشش ناصر کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے۔ ناصر جس کی اپنی امیجری بہت پر قوت ہے، آزاد کی امیجری سے کچھ لیں یا نہ لیں لیکن ان کی نثر کو وہ یقیناً پسند کرتے تھے اور یوں تو ان کی نثر کی شعوری کوشش کے تحت لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی لیکن ظاہر ہے یہ بات نہیں۔ یہ نثر جتنی بے ساختہ معلوم ہوتی ہے اتنی ہی اس پر محنت کی گئی ہوگی تو اگر ہم یہ کہیں کہ آزاد کی نثر کی انتہائی عمدہ ترقی یافتہ صورت ناصر کی نثر میں جھلک جھلک جاتی ہے تو میرا خیال ہے اس میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

بیشتر شعراء شاعری کے فن کے بارے میں اپنی آراء کا نثر میں اظہار کرتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی تو اپنا خیال ظاہر کرنا ہوتا ہے اور کبھی کسی ایسی بات کی وضاحت کرنا ہوتی ہے جو شاعری میں کی تو نہیں جاسکتی لیکن ایسی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے نثر مناسب ہے۔ ناصر نے بھی اپنی تحریروں اور مباحثوں میں اپنے تصورِ فن پر بہت کچھ لکھا ہے۔

بڑا شاعر ایک بھر پور انسان بھی ہوتا ہے اور اس کی شخصیت میں بہت سی تہیں ہوتی ہیں مگر چونکہ اس کا ذریعہ اظہار زبان ہے اس لئے وہ اپنے تخلیقی سفر میں بھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ بے شمار تجربوں کے جہنم سے گزر کر اپنی جنت تخلیق کرتا ہے۔ لہذا پڑھنے والے کو بھی اس کے فن کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے اس جہنم سے گزرنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ بڑے شاعر کا پڑھنا ایک سخت امتحان ہے۔ وہ ہر لمحہ آپ کو زندگی کے نئے گوشے اور نئے تجربے سے روشناس کر کے چیلنج کرتا ہے۔ وہ کسی قدر بے درد اور پھکڑا بھی ہوتا ہے۔

بڑے شاعر کا احساس الم غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیغام ہوتا ہے
 کسی فن پارے کو تاریخی دستاویز کے طور پر دیکھنا درست نہیں لیکن اگر شاعر کا تجربہ وسیع

ہو تو اس کی شاعری بھی اپنے زمانے کی تصویر بن جاتی ہے.....

”بڑا شاعر کسی ایک زمانے یا کسی ایک طبقے کے لئے نہیں لکھتا۔ اس لیے اس کی شاعری ہر زمانے سے بار بار ایک نیا تقاضا کرتی ہے۔“

”لفظوں کا روایتی استعمال تو ہر شخص کرتا ہے لیکن ان میں نئے معنوں کی روح پھونکنا فن کار ہی کا کام ہے۔ یہ لفظوں کا قبیلہ بھی بڑا خود سر واقع ہوا ہے۔ جب بھی کسی نئے لفظ کی ضرورت ہوتی تو زبان کے خیمے کے باہر لٹکا رہتا ہے تاکہ اس لفظ کی روح تو ہمارے خیالوں میں ہے اسے حاضر بزم کر دے۔ شاعر تو لفظوں کو اس طرح گرفتار کر لیتا ہے جیسے شیر بہن کو اپنے پنجے میں دبوچ لے۔“

”... میں نے تو لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان بھی محسوس کی ہے اور ان کے پیچ و خم کی فریاد بھی سنی ہے۔ یہ حرف ’ب‘ خیمے کا اسم تھا۔“

”جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادیب سماج اور قوم کا نفس ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داری عام شہریوں کی ذمہ داری سے بڑھ کر ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے یہاں پوری سماج یا قوم کا شعور سمٹ کر ایک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا اپنے ماضی سے اور اپنی روایت سے کوئی رشتہ ہونا چاہیے۔ اسے اس خون اور مٹی کا احساس ہونا چاہیے، جس سے اس کی ذہنیت کا خمیر اٹھا ہے۔ اس کا کوئی دین و مذہب ہونا چاہیے۔ اجتماعی عقیدے کے بغیر نہ قومیں زندہ رہ سکتی ہیں اور نہ کوئی بڑی تخلیق وجود میں آسکتی ہے.....“

”..... اب کوئی یہ کہے کہ دنیا کے کام چھوڑ کر ادب ہی کیوں تخلیق کیا جائے تو

۱۔ نادر کاظمی۔ سویرا۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ (جان پہچان۔ میر تقی میر) ص ۲۵۹ تا ۲۸۲

۲۔ نادر کاظمی۔ سویرا۔ ۱۷۔ ۱۸ (ایک مکالمہ۔ خوشبو کی بھرت) ص ۲۲۰

۳۔ نادر کاظمی۔ سویرا۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ (ایک مکالمہ۔ رفتار کا بدن) ص ۴۹۴

اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انسان کے پاس ذہن ہے، تصور ہے، یادوں کا خزانہ ہے اور ناآفریدہ مستقبل کے جواب۔ وہ ان بیولوں کو جسم دینا چاہتا ہے۔ جب تک انسان میں یہ صلاحیتیں ہیں تخلیق کا سرچشمہ رک نہیں سکتا۔۔۔۔۔

• آج کا شاعر اگر باہر سے بھی اثر لیتا ہے تو وہ اپنی مٹی کے رس اور خوشبو کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

• شاعر نے اس باولے کا بھیس بنا رکھا تھا جو ہر گاؤں کے گردا گرد چکر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ پگلا گاؤں سے کتنا پیار کرتا ہے اور گاؤں والوں کے دکھ میں کس محبت سے اشک فشانی کرتا ہے مگر اس کے باوجود اس پگلے کی پیغمبری ایک بڑا ناگوار اور دل روز فریضہ ہے جس کو ادا کرنا کسی محفل پرست، دنیا دار اور مصلحت آشنا سخن ساز کے بس کی بات نہیں۔

• مجھے تو ہر ایسے شخص کی دوستی پر شبہ سا ہونے لگتا ہے جو ہر بات کے حق میں ہو اور دوسروں کی مخالفت مول لینے کا جو کھم نہ لے سکے۔ ہر چیز کی مخالفت کرنا بے شک ایک ذہنی بیماری کی علامت ہے مگر ہر بات کے حق میں ہونا بھی ذہنی افلاس کی دلیل ہے۔۔۔۔۔ مفت کی دشمنی مول لینا میرا شیوہ نہیں مگر اپنے دشمنوں کا اعلان کرنا میرا دین ہے۔۔۔۔۔ جو ادیب کسی بات کا مخالف نہیں میں اسے سر سے ادیب ہی تسلیم نہیں کرتا۔۔۔۔۔ آج تک دنیا میں جو شخص بھی حق بات لے کر اٹھا ہے تو شروع شروع میں زیادہ تر لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے بلکہ مخالفوں ہی نے اس کی بات کو دوسروں تک پہنچانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

۱۔ ناصر کاظمی، "نیا دور" ۷-۸ (نیا اسم) ص ۹۲ تا ۱۰۲

۲۔ ناصر کاظمی، "برگ بنے" (اعتبار نقد) ص ۷

۳۔ ناصر کاظمی، "ادب لطیف" اکتوبر ۶۲ء (مرد غالب کے طرفدار نہیں) ص ۹

”ادیب کے پاس وسائل نہ سہی مگر ایک وسیلہ تو ہے۔ یہ وسیلہ لفظ ہے۔ یہ ایک سواکیواں واؤں ہے۔ سو واؤں اہل وسائل کے پاس ہیں۔ ایک سواکیواں واؤں ادیب کے پاس ہے اور یہ تو وہ واؤں ہے جس نے فرشتوں کو سجدہ کرا دیا تھا۔“

ناصر کوئی بہت بڑے نقاد نہیں تھے بلکہ یہ تو ایک شاعر کی شاعری کے بارے میں مختلف اوقات میں دی گئی آراء ہیں۔ یہ آرا کہیں ایک رومانی شاعر کی ہیں اور کہیں ایک حقیقت پسند شاعر کی اور ایسا ہونا بھی تھا کیونکہ ناصر نے رومانویت سے حقیقت پسندی کی طرف سفر کیا ہے۔ ایک وقت میں ناصر یہ کہتے ہیں کہ جو ہرن زخمی ہر جاتا ہے وہ ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بنی میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے ”یعنی تنہائی میں اجتماع کا تصور کرتا ہے، جو رومانی تصور ہے۔“

دوسرے وقت میں ناصر اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ فنکار معاشرے میں رہ کر فنکار بنتا ہے۔

”بات یہ ہے کہ باہر کی چیزیں جب اچھی لگتی ہیں جب آدمی کے اندر کچھ زندگی ہو۔ دریا اُس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو۔“

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی

تو یہ دریا کا احساس تو اندر ٹھانٹیں مارتا ہے، دریا مزاج۔ اسی طرح سے درخت ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ یہیں سے تو دنیا شروع ہوئی۔ سو یہ درخت تو

Growth کا Symbol ہے اور میری شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ درخت، شہر،

چاند، سچول، فطرت Romantic چیزیں نہیں ہیں انتظار حسین دراصل یہ

ایک بڑی مہذب تہذیب۔ جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا

ہے، اس کے استعارے، اس کی زندہ علامتیں ہیں۔ آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں، پرندے ہوں، کبوتر ہوں، چڑیاں ہوں، آسمان کھلے ہوں وہ کوئی Romance نہیں، Romantic کون کہتا ہے اسے۔ اس کے پیچھے تصور کرو اس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہوں گے جنہوں نے وہ پھول لگائے ہیں، وہ درخت بنائے ہیں۔۔۔۔

..... شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب اوورس کا بھلا ہوگا تو اس کا اپنا بھلا خود بخود ہوگا۔

..... اچھا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا لکھے۔ آپ شاعر کے شعر کو ایک ہی میرے پاس معیار ہے سن کر کچھ دیر آپ کو کسی اور کا شعر یاد نہ آئے۔ بس یہی اچھا لکھنا ہے۔ اگر میرا شعر سن کے تمہیں غالب کا شعر یاد آئے تو میں تو جیسے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے چھوٹی کا حال ہوتا ہے، وہی حال ہوگا میرا۔ بس اس سے بڑا کیا ہے۔

اور یہ جو نامرنے اپنے ایک خطبے میں کہا تھا کہ اہل وسائل نے وسائل اپنی مٹھی میں رکھے اور مسائل ہمارے کھاتے میں ڈال دیے۔ ادیب اور شاعر سے کہا جاتا ہے کہ تم قوم کے ترجمان ہو، قوم کے مسائل پر لکھو۔ اب یہ مسائل اور وسائل کی جنگ ہے۔ اہل وسائل شاداب دادیوں میں ہیں اور ادیبوں کو قومی مسائل پر لکھنے کی نصیحت کر رہے ہیں تو اس پر احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا "منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادیبوں کو بھی وسائل میں حصہ دار بنایا جائے اور اہل وسائل بھی مسائل سے نمٹنے کی کوشش کریں۔ مجھے یا شاید کسی بھی ادیب کو اس خواہش پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ادیب کو یقیناً صاحب مسائل بھی ہونا چاہیے لیکن وہ صاحب مسائل ہو یا بے روزگار ہو، اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے تو

وہ مسائل کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا..... اگر ادیب کے کھاتے میں مسائل ڈال دیئے گئے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ البتہ ادیب کو وسائل سے کلیتہً محروم رکھنا ادب اور ادیب کی ناقدری کی علامت ہے۔

اور میں سمجھتی ہوں کہ ناصر کی سوئی ہوئی اصل سوچ کو ایسی ہی تنقیدوں نے جگا دیا تھا تب ہی تو اپنی زندگی کے آخری سال میں ان کی فکر صحت مندانہ طرز لیے ہوئے تھی اور وہ اپنا کھل کر اظہار کرنے لگے تھے اور بلا جھجک اور بغیر کسی معذرت کے۔ فن کے سلسلے میں ناصر نہ صرف انفرادیت کے قائل ہیں بلکہ وہ اپنی روایت سے نظر بچا لینا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ بلکہ انھیں اپنی قابل قدر روایتیں بہت عزیز ہیں :

روایت تو دراصل پورے

اجتماع کے ماضی اور حال کے تجربات کی گونج ہے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں پھیلی ہوئی ہوئی ہو۔ محض پرانے شاعروں کو پڑھ لینے سے تو سیدھی سادی عزیل گوئی ہی نکل سکتی ہے۔

تیسرے درجے کا لکھنے والا محض روایت کا

سارے کر روایتی انداز میں روایتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور پرانے ماہرین کے فن کے چچے تلے مفرد صوفوں کو بغیر ہضم کیے اگل دیتا ہے۔ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے قاری بھی تیسرے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا روایت کو محض مورخوں کا زہدہ سمجھتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور عام انسان بھی اپنے جذبات کے ہجوم میں اپنے جذبات کی داردیتا ہے۔ اسے شاعری یا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔

صنیف! اگر تم کسی دن یہ اعلان کر دو کہ مجھے تو سبز رنگ سرخ نظر آتا ہے

تو مصوری کا اونٹ کس کر ڈٹ بیٹھے گا؟ میرا مطلب ہے کہ میں اگر سبز گھاس کی جگہ سرخ گھاس لکھ دوں تو ہماری روایت کی پرانی عوبلی میں ایک کھرام نہ مچے گا؟

کیونکہ ان کے خیال میں گھاس سبز ہی ہوتی ہے۔ ویسے سرخ بھی ہوتی ہے۔

ہر دور کو اس سے قبل کے ادوار پر یہ ذہنیت حاصل رہی ہے کہ اس کا میدان پہلے سے وسیع تر ہوتا گیا ہے مگر اس حقیقت سے فائدہ اٹھانا ہر دور کے بس میں نہیں۔

روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی عصرِ رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک پس منظر لازمی ہے۔
زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے

فن کار اپنے مقدر کے سارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ محض علم حاصل کر لینے سے اگر کوئی شخص فن کار بن سکتا تو بھلے مانس تنقید نگاروں کو کون پوچھتا؟ فن کار اپنے علم کو براہِ راست نہیں اگلتا بلکہ اسے مضموم کرتا ہے اور تخلیقی لمحوں کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ علم حاصل کرنے اور تخلیقی کام کرنے کے درمیان ایک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

علم اور تجربے کے سفر کے بعد ذہن تھک جاتا ہے اس تھکن میں سرور کے ساتھ ساتھ ایک بے زاری کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس وقفے میں فن کار اپنے علم اور تجربے کو اپنے تصور کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن سونا بناتا ہے۔

انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کر دے لیکن وہ روایت ہی نام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے سینپے کی گنجائش نہیں۔ آج ہم انسانی شعور کے ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل اگلے وقتوں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ روایت کا بیشتر حصہ جسے لوگ آج تک قابل تقلید سمجھتے رہے ہیں، اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے لیے بے جان اور بے تعلق سا ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے لیے روایت کا مسئلہ اپنی پوری ہمیت

کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ میرے کا رشب چراغ، مٹوڑی دور تک رستہ دکھا سکتا ہے، منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔

اب یہ کسی سونے بونے شخص کے خوابوں کی دھند میں لپی لپی گفتگو تو ہرگز نہیں۔ یہ آدمی تو کھلی آنکھوں سے جاگ رہا ہے اور آپ ہم سے سچی باتیں کر رہا ہے۔ اپنے خیالات کا غیر مبہم اظہار کر رہا ہے۔ ناصر کاظمی بہت فراخ دل انسان تھے۔ ان میں کسی بھی فن کار کے بارے میں تعصب نہ تھا۔ جہاں تک پسند ناپسند کا تعلق ہے تو یہ کوئی خامی نہیں۔ اس کا سبھی کو حق حاصل ہے۔ لیکن ناصر نے ایسا تو کبھی نہیں کیا کہ اپنے مخالف کو نیچا دکھانے میں بیجا الزام تراشی کی ہو۔ جو بات ان کے نقطہ نظر سے صحیح ہوتی ہے جب تک کہ ضرور دیتے تھے۔

ناصر ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک رہے اور یہاں سفینہ غزل کے عنوان کے تحت کئی پروگرام نشر کئے جن میں مختلف شاعروں اور ادیبوں پر اچھے اچھے مضمون لکھے۔ ابھی یہ مضمون شائع نہیں کئے گئے۔ اگر ان کا انتخاب کتابی شکل میں صحیح کر دیا گیا تو ناصر کی اس ناقذانہ نظر کا بخوبی علم ہوسکے جو ان کے دو شائع شدہ مضمونوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک دروپر لکھے "آم کی تلاش" اور دوسرا میر پر بنائے تازہ۔ میر ناصر کے ہیرو شاعر ہیں۔ انھیں بے حد پسند ہیں اور پسند وہی چیز آتی ہے جو اپنی افتاد طبیعت سے اور اپنے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ میر پر ناصر نے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔ نہ صرف منصفانہ رائے دی ہے بلکہ اسلوب اتنا پیارا ہے کہ ان کی کاپی بھی سمجھ میں آجاتی ہے اور ان سے اتفاق کے چلے جانے کو جی چاہتا ہے۔ یوں لگتا ہے ناصر اپنے ایک عزیز ترین شاعر دوست سے ہمارا تعارف کر رہے ہیں۔

میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد شاید اسی لیے

بنیادی فلسفہ حیات میں میرے اس قدر قریب ہیں، تو کیوں اور کیسے؟

نامر نے صرف میرے ہی اظہار خیال نہیں کیا بلکہ اور بھی شعراء کے متعلق آراء دیں۔ خود اقبال کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

”اقبال ان زمینوں کو چھوڑتا ہوا، جس زمین کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا دماغ سے مل گئی ہے، وہ اس زمین میں ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی آواز اس زمین سے ہو کر سارے عالم میں پھیلتی جا رہی ہے۔ کبوتروں کا شوق تو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل اقبال نے انسان سے رشتہ استوار کرنے کے لئے تمام مخلوقات سے دوستی کی۔ جب اسے خیر البشر نے روشنی دکھائی تو وہ انسان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ انسان کو اس نے کئی روپوں میں دیکھا اور اس نے اپنی شاعری میں اسے ہر اسماء عظمیٰ میں وہ ایک پورا فلسفہ حیات بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً آدم اور ابلیس، بساط حیات کے یہ دو مہرے اسے طاقت کے اکم نظر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی۔ ان کی جنگ وجدل اور ہرجیت سے جو روح پیدا ہوتی ہے وہ اسے انسان کے پیکر میں دیکھتا ہے دراصل وہ انسان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فطرت کی پوری طرح تسخیر کرے اور آئین خداوندی کے تحت اس پوری کائنات کی خلافت کی باگ ڈور سنبھالے۔“

”ابلیس اور آدم کا مکالمہ اقبال کے فلسفے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اسی طرح چوٹی اور عقاب کا مکالمہ آدم کی اس منزل کا سراغ دیتا ہے جہاں اس نے اپنے آپ کو انسان کے مرتبے تک پہنچایا اقبال یہاں سے قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے اور شاعری کے ذریعے ایک نمائندہ انسان کے اظہار کو جنم دیتا ہے۔“

۱۔ فتح محمد ملک، "تقصیبات" (غزل اور نئی غزل) ص ۱۵۹

۲۔ نامر کاظمی، "سویا" ۱۷-۱۸، ایک مکالمہ، خوشبو کی ہجرت، ص ۲۱۴-۲۱۵

غالب کے متعلق یوں کہتے ہیں :

”شیخ صاحب نے غالب کی جو تصرف پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل وہ صرف غالب ہی تک محدود نہیں وہ تو ہر انسان چاہتا ہے۔ غالب کی یہ معصوم اور عظیم آرزو میں ہم تک اس لئے پہنچیں کہ ایک چیز اب بھی سر پر وہ روایت میں موجود ہے۔ جسے نسخہ حمید یہ کہتے ہیں۔ اصلی غالب تو اس نسخہ میں ہے۔ عوامی غالب تو مصوّر اڈیشنوں میں بھی مل جاتا ہے۔ غالب اور حکومت کی ٹکر محض سیاسی نہیں تھی وہ بادشاہ کا استاد یا وزیر بھی نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ وہ تو بادشاہ کا رقیب بننے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہاتھی کی سواری کو اس کا بھی جی چاہتا تھا لیکن ماہر لسانیات کا الزام لینا اسے ہرگز قبول نہ تھا۔ پھر کیا تم ہے کہ عجم کا ایک سرو رواں بیماریاں کے کوچے میں خاک پھانکنا پھرے اور لال قلعہ میں زاغ وزغن کہرام مچائیں۔“ لے غالب کا دور وہ تھا جب ایک پوری تہذیب مٹ رہی تھی اس کے حصّے میں بھی تلچھٹ آیا تھا لیکن اس نے بڑے وقار سے ساقیِ دوراں کی یہ پیش کش قبول کی —

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ

ہے یوں کہ مجھے دردِ تر جام بہت ہے“ ۲

اور اپنے استاد حفیظ ہوشیار پوری کی شخصیت کے متعلق ایک دلچسپ خاکے میں ان کی غزل پر یہ بات لکھی: حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن اس کا قالب نیا ہوتا ہے۔ دراصل وہ

۱۔ ناصر کاظمی ”سویا“ ۱۷-۱۸ ایک مکالمہ خوشبو کی ہجرت (ص ۲۱۱-۲۱۲)

۲۔ ناصر کاظمی ”نیادور“ ۷-۸ (نیا اسم) ص ۹۵-۹۶

اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا..... جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کے لئے بہت بھاری زمانہ تھا۔ بیسیوں میں دو چار کا کہیں کچھ بناؤ تھا۔ لیکن حفیظ اپنی روش پہ ڈٹا رہا۔ وہ نگین کی طرح گھر میں گڑ کر بیٹھا رہا اور اس نے گنج تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے ویرانگی کی۔

اور یہ ہے ابن انشا کی چاند نگر پر ناصر کا تبصرہ۔

..... انشا جی افادِ طبع کے لحاظ سے بے شک رومانوی بلکہ الف لیوی مزاج کے

شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں محبت کے سوانحے زمانے کے سیاسی اور نفسیاتی مسائل بھی ملتے ہیں۔ وہ کافی حد تک ترقی پسندانہ موضوعات کو عزیز رکھتے ہیں لیکن انھیں آنچل کو پرچم بنانے کا شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں نعرے بازی نہیں بلکہ دھیمی دھیمی دل کو چھو لینے والی کیفیات ہیں جو سچی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔

ناصر اپنی تحریر اور گفتگو میں اُواسی کا عنصر غالب نہیں آنے دیتے۔ بلکہ ان کے ہاں شگفتگی اور خوش طبعی کی لہر ڈوبتی، ابھرتی رہتی ہے۔

’ ایک بار عجیب لطیف ہوا۔ میر صاحب کا یہ شعر پڑھا :

میر صاحب رُلا گئے سب کو

کل دے تشریف یاں بھی لائے تھے

شروع ہی سے یہ سکھایا گیا تھا کہ جس سے ملو ملو دبانے ملو۔ اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ حالانکہ بڑا بننے کی ہوس تو شروع ہی سے ہر انسان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ میر کا یہ شعر پڑھ کر بڑا تاؤ آیا کہ عجیب بے تمیز شاعر ہے۔ اپنے لیے صاحب اور تشریف لائے، ایسے لفظوں کا استعمال روار کھتا ہے والدہ کے پاس گیا اور نانا ہنس پڑے.....

۱۔ ناصر کاظمی، ’نعرش‘ شخصیات نمبر (حفیظ ہوشیار پوری) ص ۱۱۰۹

۲۔ ناصر کاظمی، ’ہالیوں‘ اکتوبر ۱۹۵۵ء، مطبوعات، ص ۲۸۳

اس عرصے میں گاہے گاہے کلیات میر کی ورق گردانی بھی کر لیتا تھا۔ زم شانه لڑکوں کا ذکر دیکھتا تو جیا آتی، کفر والحاد کے شعر پڑھتا تو کانپ جاتا، شمشیر، خنجر، تلوار، تیر، تیر اور کمان ایسے لفظوں سے دم گھٹتا کہ یا اللہ یہ شاعر ہے یا توپ خاں نے کا داروغہ۔

یہ بھڑی فنکار نہیں مگر جو چھتہ یہ بناتی ہیں ویسا فن شاید تمہیں کہیں نہ ملے۔ بھڑوں کا نشیمن خود ایک فن پارہ ہے۔ میرے بھائی! ہمیشہ ایک ساموسم نہیں رہتا۔ اور بارش ہر روز نہیں ہوتی۔ بھڑی اگر سال بھر چھتے بنائیں تو جی بھی تم انھیں فنکار مانو گے؟ فنکار تو میں نے انھیں ازراہ جو انفرادی کہہ دیا۔ وہ فنکار نہ سہی لیکن ان کے مزاج میں اس ذات کی ایک چاشنی ضرور نظر آتی ہے۔ پہلی سنو گے!

کالے منہ پر پیلا ٹیکہ پن مارے وہ روئے
یہ بھڑ کا باپ ہے۔ تم اسے تاگا بانڈھ کر نہیں اڑا سکتے۔

”اپنے لیے تو آسمان اور زمین اس وقت تک دو الگ الگ چیزیں تھیں جب تک پتنگ نہ چڑھائی تھی ادھر پتنگ چڑھی ادھر میں آسمان پر۔ آسمان اور زمین کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ تب سے جاری ہے۔ اب بھی وہی افق ہے اور وہی اڑائیں لیکن پتنگ نظر نہیں آتی۔ تارا بن گئی۔ ڈور البتہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اب جنگ سیاروں سے ہے۔ جب ہاتھ ذرا بھاری ہوتے ہیں تو چونکتا ہوں کہ کوئی سیارہ نبرد آزما ہوا چاہتا ہے۔“

”اس منظر حیات کو جرمن فلاسفر ”ولٹن شوٹنگ“ کہتے ہیں۔ باقی انہی سے پوچھیے۔“

۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان۔ میر۔ نائے تازہ)

۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان۔ میر۔ نائے تازہ)

اور دیکھنے اپنے محترم استاد کا خاکہ :

..... شیخ یہ یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بھی تھی گہرا سانولا رنگ، پچکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، سرمئی برف سے بال، گہرا جسم، چھوٹی چھوٹی کپجوں سی آنکھیں، کرسی پہ سے اُچکتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آ کر اپنا کلام سناتا۔ صاحبِ صدر دل بڑھلاتے اور داد دیتے۔ لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں میں مگن تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعران کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے۔

..... ” اگلے دن میں سگرٹ لے کر کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میل خوراگرے ساسوٹ پہنے، مٹائی میں ننھی سی گرہ، دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اردگرد کی چیزوں سے یکسر بے خبر کسی کو ڈھونڈتی ہوئی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی چلتی دکھائی دی۔

..... ” اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی مجھے کچھ ہنسی سی آگئی لیکن میں ضبط کر گیا۔“

ناصر کی نشراور گفتگو پر محمد حسین آزاد کا بہت واضح اثر ہونہ ہو لیکن ناصر تمثیلوں میں بات مزور کرتے ہیں۔

” یہ لفظوں کا قبیلہ بھی بڑا خود سداق ہوا ہے۔ جب بھی کسی نئے لفظ کی ضرورت ہوتی تو زبان کے خیمے کے باہر لٹکارنا پڑتا کہ اس لفظ کی روح تو ہمارے خیالوں میں ہے اسے حاضر بزم کرو۔ شاعر تو لفظوں کو اس طرح گرفتار کر لیتا ہے جیسے

شیرہرن کو اپنے پنجے میں دبوچ لے لے

”قلم چکی پلائے گا، میں لفظوں اور خیالوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ڈالوں گا، جو کچھ پس کر
گرتا رہے آپ اسے سیٹے رہیں۔“

ڈرامائی انداز گفتگو کا ایک نمونہ دیکھئے :

”ایک رات میں سوتے سوتے چونک پڑا۔ میرے کمرے کے باہر درخت آپس میں
بحث کر رہے تھے۔

پہلی آواز : چلو کمرے کے اندر چلیں !

دوسری آواز : نہیں وہاں ہماری برادری نہیں۔ انسان ہمارا دشمن ہے۔

پہلی آواز : تم جنگلی ہو۔ انسان نے ہمیں جذب بنایا۔ ہم پراحسان کی۔

دوسری آواز : انسان اور ہم میں کیا قدر مشترک ہے ؟

پہلی آواز : اس مکان کا رہنے والا محض انسان ہی نہیں، فن کار بھی ہے۔ اس کے اندر بھی

ایک سدا بہار درخت ہے۔ میں نے بار بار اس سے گفتگو کی ہے۔ دیوار کے شکاف سے

جھانک کر دیکھو! ہماری برادری انسان سے کتنی مانوس ہے۔ وہ میزیں، کرسیاں،

پلنگ اور الماریاں سب درخت تھے۔ تم انھیں پہچاننے کی کوشش

کو۔

دوسری آواز : تم انسان کے جاسوس ہو! تم جاؤ میں تو واپس جاتا ہوں۔“

ناصر عجیب اور خوبصورت باتیں کرتے ہیں۔ وہی ”بلند آواز میں شعر

۱۔ ناصر کاظمی ”سویرا“ ۱۷-۱۸ ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت (ص ۲۲۰)

۲۔ ناصر کاظمی ”سویرا“ ۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان میرے بنائے تازہ) (ص ۲۶۲)

۳۔ ناصر کاظمی ”سویرا“ ۱۷-۱۸ ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت (ص ۲۲۰)

سوچنے والا انداز :

’ لفظیوں آئیں جیسے کسی نے چراغ جلا کر رکھ دیئے ہیں ‘
 ’ میں جب تازہ غزل کہتا ہوں تو میر کو بھی سبنا تا ہوں اور احمد مشتاق کو بھی ‘
 ’ دریا اس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو ‘
 ’ میں تو اب تھکا ہوا سورج ہوں دیوار تمام کر چل رہا ہوں ‘
 ’ میں سرسوں کے پھول کو اپنا ہم عصر کہوں گا ‘

اسی آخری فقرے کی وضاحت اپنے ٹی وی انٹرویو میں وہ یوں کرتے ہیں :

’ اصل میں سرسوں کا پھول تو ایک - آپ کو پتہ ہے سرسوں کا پھول کس چیز کا نام ہے وہ
 بظاہر تو آپ کو ایک پتی سی زرد سی نظر آتی ہے - وہ تو ایک موسم، ایک رنگ، ایک تہذیب کا نام ہے تو
 وہ پوری تہذیب میری ہم عصر تھی۔ اس لئے کہنے کو یہ فقرہ گویا اس میں فقرگی کا شوق ہے، تو
 سرسوں کے پھول کے ہم عصر کا مطلب ہے کہ سرسوں کے ساتھ جتنی تہذیب اور رنگ اور میلا اور
 اس کے ساتھ ہرنوں کا چوکڑی میں بھرنے اور وہ رنگ میلے ہونا اور وہ زرد زرد موسم اور آسمان وزمین
 میں قوس قزح کا ترنا۔ اس سارے میں ... میرے پورے عصر کی روح تھی اس میں سے تو،
 میں نے ایک چیز لے لی ‘

ع۔ نجر باہر کی لایا ہے کوئی گل پارہ

سرسوں کے پھول سے دکھانا مقصود تھا اس پوری دھرتی کو ؛ لے
 تو یہ ہے ناصر کی نثر جس سے صاف طور پر واضح ہے کہ یہ ایک شاعر کی نثر ہے اور اسی لیے اس
 میں نئے پن اور تازگی کے ساتھ ساتھ ایک منفرد اسلوب ہے - ہمارے لیے غزل گونا ناصر کی نثر کی خوبیوں
 کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس طرح ہی ناصر کی شخصیت مکمل ہوتی ہے - کیونکہ باوجود تخیل
 سے مالا مال گفتگو کے اس میں زندگی کی مسکراہٹیں، سچائیاں اور شگفتگیاں سمٹی ہوئی ہیں - یوں

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُداس، حیران اور بعد میں تیز دھوپ میں آنکھیں کھول لینے کی بہت رکھنے والے اس شاعر کے پاس پُر اعتماد مسکراہٹیں بھی ہیں۔ نحیف اور دل کو دکھ نہ دینے والے بلکہ سوچ پر مجبور کر دینے والے طنز بھی ہیں۔ میٹھی میٹھی چٹکیاں ہیں، خوبصورت چھوٹے چھوٹے مگر مکمل فقرے، نئے، حسین، نرم نرم الفاظ۔ ساتھ ہی باوجود شاعرانہ رنگ کے اس میں اتنا زور ضرور ہے کہ اس نثر میں دلیل بھی دی جاسکتی ہے۔ اپنی سوچ اور اپنی رائے کا خوب سے اظہار بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس میں بے تکلفی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ناصر آپ کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ یوں تو ابھی ناصر کے نثری نمونوں کا کوئی مجموعہ اور ان کی ڈائریاں شائع نہیں ہوئیں لیکن اگر ایسا کیا گیا تو ایک دلچسپ اور منفرد اندازِ تحریر اور ایک انفرادیت رکھنے والے شاعر کی واضح سوچ سامنے آئے گی۔ یوں تو ناصر کی انگریزی سے ترجمہ شدہ صحیح کتاب "امریکی سوسائٹی" شائع ہو چکی ہے لیکن اصل ناصر اپنی طبع زاد تحریروں میں سے ہی جھانکتا ہے۔

اور اب آئیے آخر میں ناصر کی باتیں سنیں جو صرف الگ سی سوچ رکھنے والے شاعر ہی نہیں، ایک شفیق دوست بھی ہیں۔ "ادیب" شاعر کو ایک بات سے پہچانتا ہوں بلکہ کئی باتیں ہیں لیکن چلیے ایک نشانی بتا دوں تمہیں۔ آپ سورج کو کیسے پہچانتے ہیں۔ ایک طرف سے نکلتا ہے، ایک طرف ڈوبتا ہے یہی نا۔ ذرا مجھے کوئی آدمی زیادہ کامیاب نظر آئے تو میں اس کے ادب و ادب پر شک کرنے لگ جاتا ہوں۔ ذرا زیادہ ہی کامیاب زندگی میں۔ اور آپ دیکھتے کہ شاعر کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جو مختلف شعبوں میں پڑے ہیں اور وہ شاعر ہیں، تخلیقی لوگ ہیں۔ ننھے ننھے مزدور۔ میں نے تو دفروں میں بعض کلرکوں کو دیکھا ہے اور بعض ریڈیو میں، بعض ادھر ادھر اداروں میں۔ وہ بڑے تخلیقی لوگ ہیں۔ وہ بڑے خاموش خادم ہیں۔ اس سے بڑا کون شاعر ہے انجن ڈنایور سے بڑا جو کتنے ہزار اور کتنے سو مسافروں کو لاہور سے کراچی لے جاتا ہے اور کراچی سے واپس لاتا ہے۔ مجھے یہ آدمی بہت پسند ہے اور ایک کانٹے والا۔ پھاٹک بند کرنے والا۔ یہ بھی شاعر ہیں۔ میری برادری کے لوگ۔ اپنا اپنا ROLE ہے۔ آپ کو پتہ ہے اگر وہ پھاٹک کھول دے، گاڑی جب آرہی ہو تو کیا قیامت آئے۔ بس شاعر کا بھی یہی کام ہے کہ کس وقت پھاٹک بند کرنا ہے کس وقت کھولنا ہے"۔

چھٹا باب

ہر دور کی غزل میں میرا نشان ملے گا

اتنے اعتماد سے اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا کون ہے؟ یہ ہیں ناصر کاظمی، اور انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو۔ بات صرف اتنی سی نہیں کہ میری غزل زندہ رہے گی۔ اس کا محرک تو وہ جذبہ ہے جو ایک فن کار کو اتنی وسعت دے دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف صدیوں پہلے کے آئینوں کا عکس بنا دیکھتا ہے بلکہ آئندہ کتنے ہی زمانوں میں اپنے آپ کو ان آئینوں میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہے:

شعر کہنے کا مزہ جب ہے کہ صدیوں تک ندیم
آئینے بنتے چلے جائیں مرے اشعار سے (ندیم)

اسے اپنی جسمانی فنا کا خیال بھی نہیں رہتا۔ ہو بھی کیسے؟ وہ تو زندہ تھا اور زندہ رہے گا۔ یہ جو ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ ”میں اپنی غزل میر کو بھی سنا تا ہوں اور احمد شاق کو بھی“ تو انہوں نے حال کے علاوہ ماضی تک میں اپنی موجودگی کی خبر دی تھی اور پھر یہ کہہ کر آئندہ مستقبل کے ساتھ بھی چلنے لگے تھے کہ ”میر تو خیر ہمارے ماضی کا درشہ ہیں، میں تو اسلم انصاری کو بھی اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے پندرہ سال بعد لکھنا شروع کیا۔“

جب وہ یہ کہتا ہے کہ اتنے سارے لوگ ہیں اور میں تنہا ہوں، تو میری تنہائی جاگ اٹھتی ہے، اسی لئے جب انتظار حسین ٹی۔وی انٹرویو میں ان سے سوال کرتے ہیں کہ ملتے شاہ، کبیر، سورد اس میرا بانی، ان شاعروں سے تمہارا کیا رشتہ ہے تو ناصر جواب دیتے ہیں:

اصل میں، شاعر جو، جنسے بھی دنیا میں وجود ہیں، سرمایہ ہیں سب کا۔ کسی جزائیاں^{نی} حدود میں بند نہیں، مجھے تو سپین کا شاعر لورکا (Lorca) بھی پسند ہے۔

Garcia Lorca - اور تمہیں پتا ہے کہ میں اسے ایسے پڑھتا ہوں جیسے تمیر۔ تمیر کا ذکر اس لیے کرتا تھا کہ ایک خاص فن میں، پاکستان بننے کے بعد تمیر کے کلام کی گویا ایک Relevance سی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے ان شاعروں کو اس لیے پڑھا کہ وہ مجھے اتنے پسند تھے کہ یوں لگتا تھا کہ یہ کلام یا تو میرا ہے یا مجھے لکھنا چاہیے تھا۔ میں تو انہیں اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا بانی ہوں، خواہ وہ لورکا ہو، خواہ وہ کالی داس ہو، خواہ وہ رامبو ہو۔ تو یہ تو سارے میرے ہم عصر گزرے ہیں۔

یوں جب ناصر ہر دور کی غزل میں اپنی موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر غزل گو کے کلام کو اپنا کلام سمجھتے ہیں اور اپنے کلام کو ان کا حصہ جانتے ہیں۔

ناصر کی خوبصورت غزل کی بنیادیں مضبوط کرنے میں ان کی روایت پسندی دہ کہ روایت پرستی) کو کافی دخل ہے۔ ناصر کو ماضی بہت عزیز ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کا اپنا ذاتی ماضی بہت شاندار تھا بلکہ اس لئے کہ وہ جانتے تھے، انہیں اس کا احساس اور شعور تھا کہ ان تک چل کر آنے والے زمانے کے پاس صدیوں کا تجربہ تھا۔ یہ تہذیب اس

۱۔ ناصر کاظمی۔ رسالہ "ادب لطیف"، نومبر ۱۹۶۲ء (میرا ہم عصر)، ص - ۶

۲۔ ناصر کاظمی۔ ٹی۔وی انٹرویو۔ ۲۰۰۶ء انٹرویو لینے والے تھے انتظار حسین

کی قدریں یہ سب کچھ صدیوں کے تجربات سے بنے سانچوں میں ڈھل کر آرہی تھیں۔ یوں شاید عام حالات میں ان کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا لیکن جب سب کچھ کے کھوجانے کا ڈر پیدا ہوا اور یوں لگا کہ متاعِ چھینی جا رہی ہے تو تب احساس ہوا کہ ”پاکستان نے بے شک بہت ترقی کی ہے۔ وہ بے سرو سامانی کی منزل سے گزرا اور ساز و سامان پیدا کیا۔ بنجر زمینوں میں گل و گلزار کھلے۔ کارخانے قائم ہوئے۔ تجارت نے فروغ پایا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا ایک نیا نقشہ قائم ہو گیا جس نئی لہریں کو دھیان میں لاؤ اور نئے نقشے کو دیکھو۔ دنیا کتنی نئی ہے مگر بھیر مجھے یہ اتنی پرانی کیوں نظر آتی ہے۔ کون سی شے کم ہو گئی ہے کہ ہم نے نئی دنیا بنا کر بھی دیکھ لی اور وہ فوراً پرانی نظر آنے لگی۔ حال کا حال بے حال ہے۔۔۔ حال کو دیکھنے کے لئے سوچنا نہیں ہے۔ ماضی کی یادیں اور مستقبل کے خواب۔ مگر اب ہماری دونوں آنکھوں کی بینائی شاید کم ہو گئی ہے۔ ماضی کی یادیں دھند لا گئی ہیں۔ مستقبل کے خواب منتشر ہو گئے ہیں۔ تب ناصرتہ صرف ماضی کی روایت کی تصویر اتارنے کے لئے تیار ہوتے بلکہ اس تصویر میں مستقبل کے خوابوں اور نئی روایتوں کے رنگ بھرنے کی بھی سوچی ان کے نزدیک۔۔۔۔۔ زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے ستارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے پینے کی گنجائش نہیں۔۔۔۔۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا“

۱۔ ناصر کاظمی۔ ڈی۔ وی۔ انٹرویو۔ ۲۰۰۲۔ انٹرویو لینے والے تھے انتظار حسین۔

۲۔ ناصر کاظمی۔ رسالہ ”سویرا“ ۱۴-۱۸ ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت، اگست ۱۹۹۹ تا ۲۰۰۰

تب نئی روایت بنانے کے لئے سب سے پہلے تو ناصر نے اپنے ماضی کے سرمائے کے لعل و گوہر کی شناخت کی۔ ناصر کاظمی ماضی کے تجربات سے وصل کی آرزو میں میر کے زمانے تک گئے تو ان کے ہاں اقبال کا رنگ مدہم پڑا اور میر کے رنگ پر نئی آب و تاب آئی۔ پھر ناصر نے حال کے تجربات کو حاصل کرنے کا کرب سہا اور پوری سچائی اسادگی اور خلوص کے ساتھ ان کا اظہار کر دیا۔ ناصر کی غزل سے کچھ عرصہ پہلے اردو غزل کے اشعار جذبہ و احساس، حتیٰ کہ فکر تک کی سچائیوں کے بے ساختہ مگر فن کارانہ اظہار سے زیادہ تر مخروم نظر آتے ہیں اس لئے کہ اس سب کچھ کو پورے انصاف کے ساتھ اس وقت نظم میں برتا جا رہا تھا اور کچھ کو چھوڑ کر بیشتر غزل کو محض ”تفریحی صنف سمجھتے تھے اور یا پھر انہوں نے اظہار پر پابندیوں سے مجبور ہو کر غزل کو اپنا یا تھا۔ ناصر کاظمی کی غزل گوئی کی ابتدا اور حیرت انگیز ترقی کا زمانہ بھی یہی ہے۔ نئی غزل کی تاریخ میں ناصر کاظمی کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا کہ انہوں نے ہر دو روٹیوں کو رد کر کے ایک نئے رویہ کو جنم دیا۔۔۔۔۔ وہ یہ احساس لے کر اٹھے کہ جب تک غزل اہم ترین صنف سخن نہیں بن جاتی، ملک سخن کا سماں سنان رہے گا۔“ ناصر کاظمی نے ہجرت کے تجربات، ماضی کی یادوں، اپنے جذبہ و احساس کی زرم تہوں اور اپنی سوچ کی دھیمی لہروں کو تغزل کی اعلیٰ خصوصیات اور مانوس مگر بالکل نئے طرز زبان کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ اردو غزل میں ایک نئے، بلند، مضبوط اور روشن مینار کا اضافہ ہو گیا جس کی شعاعوں نے غزل کے میدان میں بکھرے اس وقت کے اندھیروں میں بہتوں کو راہیں دکھائیں۔ بے شک اور بھی شاعر اس وقت غزل کہہ رہے تھے اور کئی شعرا نے اردو غزل میں اپنا مقام بھی بنا کر شروع کر دیا تھا مگر ایک نئی چیز، ایک مضبوط اور

۱۔ فتح محمد ملک۔ ”تغصبات“ غزل اور نئی غزل، ص۔ ۱۵۹

انگ سی آواز کا احساس اس وقت صرف ناصر کاظمی کا ہے۔ ”ناصر کاظمی ایک اچھا غزل گو نہیں تھا ایک عظیم غزل گو تھا۔ عین اس دور میں جب صنفِ غزل اپنی لعین پابندیوں اور حد بندیوں کے باعث دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں دبنے لگی تھی، ناصر غزل ہی کا علم بلند کر کے اٹھا اور اپنی جیتی جاگتی شاعری سے غزل کے وقار کو بحال کیا۔ غزل میں عصری رویوں کا انعکاس تو علامہ اقبال کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریک نے بھی غزل کو کئی دہائیوں سے متعارف کرایا مگر ناصر کے پاس اظہار کا جو دل آویز سلیقہ تھا وہ جدید ہوتے ہوئے بھی غزل کی فضا سے ہم آہنگ تھا۔ ناصر کی حدتِ غزل کی روایت ہی سے پھوٹی تھی اس لئے ناصر اور اس کے قاری کے درمیان وہ فاصلہ کبھی حاصل نہ ہوا جو آج کہتے ہی جدید شعرا اور ان کے قارئین کے درمیان حاصل ہے اور نتیجہ جس کا یہ ہے کہ شعر و ادب کا قاری معاصر شعر و ادب سے بدظن ہو رہا ہے۔ جب تک فن مفہوم کی ترسیل کا فریضہ ادا نہیں کر پاتا، وہ اپنے وجود کا کوئی جواز پیش کرنے سے بھی قاصر ہے۔ ناصر کاظمی کی غزل اس حقیقت کی ایک بلیغ مثال ہے کہ فن بظاہر سادگی کے باوجود بلیغ اور مفہوم سے مملو ہو سکتا ہے۔ غزل کو اتنا سادہ رکھ کر اتنی دور کی، اتنی گہرائی کی باتیں کہہ جانا، اردو کے جدید غزل گو شعرا میں سے صرف ناصر کاظمی کا کام تھا۔ یوں سمجھئے کہ ناصر کے ہاں میر، مصحفی، غالب، مومن اور فراق کے اپنے اپنے منفرد حسنِ ادا ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ غزل کی روایت کے اس احترام کے باوجود ناصر کا ایک اپنا انفرادی اسلوب ہے اور جدید غزل کے موجودہ رجحانات کے پیش نظر ناصر کا یہ اسلوب ناقابلِ تقلید معلوم ہوتا ہے۔“

در اصل ناصر سچ بولے۔ آخر تک جو کچھ انہوں نے محسوس کیا، جو پھیل ان کے اندر مچی، جو

سوچیں انہیں، آئین ان سب کا بلا تکلف سچائی سے اظہار کر دیا اور حق بات پر اُردو بیٹھتی
 نہیں سکتی، اس کی چمک اپنی جھلک زمانوں تک دکھاتی رہتی ہے۔ سوزِ ناصر کے اشعار
 پر اے نہیں ہو سکتے۔ چاہے ان میں ہجرت کے تجربات کا خوبصورت بیان ہو:
 خنجر میں ہوئی ہے شام ہم کو : بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
 یارات میں چاند نکل آئے :

اُدین شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی
 اجنبی مہاک پا کر ہم نکل پڑے گھر سے
 یا اپنے محبوب کی یاد ہو :

میری ساری عمر میں : ایک ہی کمی ہے تو
 یہ سب ایسی تسویہیں ہیں جن کے رنگ ابھی تک گیلے ہیں۔ ناصر کی غزل کے
 شروع میں ”اداسی“ اور آخری دور میں ”امید“ یہ دونوں مختلف ردیے ناصر کی شخصیت
 کے دونوں رخ دکا کر اسے مکمل کر دیتے ہیں۔ ناصر جہاں ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ:
 بیٹھے بیٹھے برس پڑی آنکھیں : کر آئی بھر کسی کی اُس اداں

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا : جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

جہاں ہیں یوں تو کہے ہیں مگر پیارے : یہ تیرے پھول سے چہرے کیوں اداسی ہے

اد پچھلی رت کے ساتھ تھی : اب کے برس میں تنہا ہوں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
 تھوڑی سی خاکِ کوچہ دلبر ہی لے چلیں
 اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
 آئے شبِ فراق، تجھے گھر ہی لے چلیں
 تو ہیں یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں:-

وقت اچھا بھی آنے کا ناصر : غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

چہرہ افروز ہوتی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرد
 دل کی افردگی کچھ کم تو ہوتی ہم نفسو شکر کرد

اتنے دکھوں کی تیز ہوا میں : دل کا دیپ جلا رکھا ہے

ایسا بھی کوئی سہنا جاگے : ساتھ مرے اک دنیا جاگے
 اس طرح کے اشعار اگر کسی غزل گونے پہلے کہے تو وہ فراق ہیں۔ فراق جب یہ غزل کی
 بیسی آوازوں میں سے ایک ہیں اور نئی نسل کے شعرا ان سے کئی مختلف انداز سے اڑتے
 رہے ہیں۔ ناصر نے فراق سے اپنے کسی ”رشتے“ کا ذکر نہیں کیا لیکن انہیں فراق پسند ضرور
 تھے اور اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ فراق بھی جب ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو میر سے ہی
 اپنا دلپسی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ ناصر پر فراق کا اثر خصوصاً عشقیہ اشعار میں زیادہ ہے
 لیکن ناصر بھی فراق کی طرح کئی شعرا کی آوازوں کی سراپا ایک آواز میں تحلیل کرتے گئے۔
 یوں وہ اپنی انفرادیت کو مجرد کر کے مجرم نہ ٹھہرے بلکہ اس طرح بھی ان کے منفرد
 ہونے کی حقیقت مزید روشن ہوئی۔

عشق کا موضوع غزل کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اب چاہے یہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی یا پھر کسی بھی چیز کا عشق ہو، وہ غزل کے حسن میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ میر کو تو عشق حقیقی کے ابھرنے اور قائم رہنے کے لئے سازگار ماحول میسر تھا اور وہ جب اپنے مجازی عشق کی ناکامیوں سے گھبراتے تو عشق حقیقی میں پناہ لیتے۔ لیکن ناصر کو جب محبت میں ناکامی ہوئی تو وہ راتوں کو جاگنے لگے اور انہوں نے اس طرح سے سچائیوں کو پانے کی کوشش کی:

ترے بغیر بھی خالی نہیں مری راتیں

ہے ایک سایہ مرے ساتھ ہم نشیں کی طرح

اسی لئے تو انتہائی ادا سیاں اور ناکامیاں انہیں ایسا شعور دے گئیں کہ وہ دوسروں کے دکھوں اور غموں سے بیٹھ مڑ کر نہ بیٹھ رہے بلکہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے غم زدوں کے قریب جا پہنچے اور اپنے اندر کی تمام ہمدردیوں، خلوص، پیار اور محبت سے انہیں دیکھنے لگے۔ ایسی خاموشیاں گونگی نہیں ہوتیں، بولتی ہیں، بہت کچھ کہتی ہوتی، سمجھاتی ہوتی، تسلی دیتی ہوتی محسوس ہوتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں۔ ”بھئی تم اکیلے تو ادا اس نہیں ہو۔ میں جو ہوں، میں بھی تو ہوں تمہارے ساتھ! چلو آؤ مل کر مسکرانے کی کوشش تو کریں!۔“

جو دل دکھا بھی تو ہنٹوں نے بھول بسائے : خوشی کو ہم نے شریکِ ملال کر دکھا

تویں ان کا عشق ان کے دل میں وہ روشنی بنا گیا جس کی کرنوں میں ناصر نے ساری کائنات اور ساری انسانیت کو جھلملاتے دیکھا۔ تب وہ محبت و محبوب سے متعلق اشعار کے ساتھ ساتھ کائنات اور فطرت کی محبوب چیزوں کو گلے سے لگاتے ہوئے اشعار بھی کہتے ہیں۔ اس طرح فطرت محبوب کے حسین تصور اور یاد کو قائم رکھنے والی بن گئی:

ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں : تری آواز جیسے دل سے گزری

لے اڑی سبزہ خود رو کی بہک : پھر تری یاد کا پہلو نکلا

وہ ستار تھی کہ شبنم تھی کہ پھول : ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
یوں ان کی اُداسی محبوب کی یاد کے راستے ہوتی ہوتی فطرت میں پہنچی۔ پھر وہاں سے کائنات
میں کھیل گئی اور تب ناصر کو معلوم ہوا کہ :-

دھوپ سے چہروں نے دنیا میں : کیا اندھیر مچا رکھا ہے
ناصر کے جذبہ و احساس و فکر کو یہ خبر پہنچی تو ان کی اُداسی بھی معنی خیز بن گئی :-
اُداس پھرتا ہوں جس کی دھن میں برسوں سے
یونہی سی ہے وہ خوشی، بات وہ ذرا سی ہے

چمکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اُداسی ہے

انہوں نے خیردار کیا :-

ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے ٹیروں کے
ابھی جمائے رہو مورچے کنا دے پر

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو، سورج کرن کو تر سے گا

تب ناصر نے دعا مانگی :-

عمر بھی کی نوا گری کا صلہ : اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے
بستیوں کو دیتے ہیں تو نے چراغ : دشت دل کو بھی کوئی راہی دے

اور آندریوں ہوا کہ :-

بدلتا وقت یہ کہتا ہے ہر گھڑی ناصر

کہ یادگار ہے یہ وقت انقلابوں میں

یہ وہی ناصر ہے جسے ٹھہرے ٹھہرے مناظر اور ساکن لمحے بھاتے تھے۔ اب اسے زندہ متحرک چیزوں سے لگاؤ ہو گیا۔ کئی ناقدین کے لئے یہ ناصر لسنیڈ یہ نہ ٹھہرا۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے ذہن میں ”برگ نے“ والا ناصر لبا رکھا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ لیس وہی تصور ساکن ہو جائے۔ کوئی نیارنگ ہو بھی تو اسی تصویر کے نقوش کو واضح کرنے کے لئے لگایا جائے۔ حالانکہ یہ تصویر نہیں تھی، یہ تو ناصر تھا۔ ایک انسان، ایک خالق۔ انہیں تو وقت کے ساتھ ساتھ آگے قدم اٹھانا ہی تھے۔ وہ جب اپنی ذات سے باہر نکل آئے اور خدا کی طرف سے بخشے گئے سونے کے ذرات سے اپنے فن کی دنیا کو سنہرا کرنے لگے، اسے سچائی کی دھوپ دینے لگے، ارد گرد کی تلخ و شیریں اور مکروہ اور حسین چیزوں کی آنکھوں میں اپنی نظروں کی روشنی اتارنے لگے تو کہا گیا:

”اس وقت تک ناصر کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا لیکن اس دوران میں ان کا جو کلام رسالوں کے ذریعے ہمارے سامنے آتا رہا ہے اس کی بنا پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ ”برگ نے“ کے بعد ناصر کی شاعری ارتقا کی بجائے انحطاط کا راستہ طے کرتی رہی ہے۔ ان کی شاعری جو گہرے تجربات سے پہلے بھی زیادہ بہرہ ور نہ تھی، اب گہرے تجربات سے اور زیادہ تہی دامن ہو چکی ہے۔ ان کی موجودہ شاعری کی بنیاد بڑی حد تک ہلکا بھلکا رومانی یادوں پر ہے جن کے بیان میں وہ اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے کہ عشق سے متعلق جتنی معمولی معمولی باتیں عاشق کو عزیز ہوتی ہیں، ضروری نہیں کہ عاشق کی غزلیں پڑھنے والوں کو بھی وہ اتنی ہی عزیز ہوں۔ شاعر سے قاری کی توقع یہ ہوتی ہے کہ وہ یا تو انسانی تجربات کے گہرے درازوں کو پہلوؤں کو بیان کرے یا معمولی باتوں کو غیر معمولی اسلوب میں ظاہر کرے؛

پہلے تو ناصر کا جواب سن لیجئے :-

”برگ نے“ کے بعد دراصل میری شاعری کا جو ایک لحاظ سے بہتر اور زیادہ تخلیقی دور ہے، میرے خیال میں وہ — اتنا خوب صورت دور تو نہیں لیکن وہ ”برگ نے“ کے بعد ہی شروع ہوا۔ میں ”برگ نے“ کے بعد لکھتا رہا اور لکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر چھپتا کم رہا ہوں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ”برگ نے“ کے بعد میں خاموش ہوں تو وہ خود اصل میں لاپتا ہیں۔

یہ کتنا ستم ہے کہ ایک ہم عصر نقاد کو جو خود بھی غزل کہتا ہے، ناصر کا ارتقا اس کا انحطاط دکھائی دینے لگا۔ اب یہ شعار دیکھتے کیا ان میں بہت گہرے نہ سہی۔ گہرے جذبات کی کمی ہے :-

کچھ اس ادا سے اڑا جا رہا ہے ابلت رنگ
صبا کے پاؤں کھڑتے نہیں رکابوں میں

یہ گنہگاروں کی سرزمین ہے بہشت سے بھی سوائیں
مگر اس دیار کی خاک میں سببِ نم کوئی ادر ہے

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جانکلے
یہ ہم سفر مرے، کتنے گریز پانکلے

ہستی کا بھرم کھول دیا ایک نظر نے
اب اپنی نظر میں ہیں جہاں اور طرح کے

اور عشق سے متعلق اگر شاعر ”معمول معنوں“ باتیں کر رہا ہے تو عرض یہ ہے کہ عشق میں نونی معمولی بات تو ہوتی ہی نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ تخیل معنوں میں عشق کیا گیا ہو اور اس عشق کے گداز سے زندگی کو نکھارا اور سردار کیا ہو۔ یاد کیا کہ ماہر نے نکھارا اور سردار اب شمسِ ناصرتی سے لیتا ہے۔

نئے نئے پڑے بدل کر جاذب کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے

وہ شخص تو شہرہ سی پھوڑ گیا میں باہر جابوں کس کے لئے

تو اس میں ”معمول پن“ یہی ہے ناکہ یہ آج کا عاشق ہے جس کی نزدیکی کا یہی انداز ہے نہ کہ تھمتے

سے سر پھوڑ کر جان دے دینے والا۔ تقدیر ہے۔ اب یہ یادیں دیکھنے کی یہ ”ہاکی پھیلنی یادیں“

ہمارے دل کی انتہائی نازک تاروں کو مضرب بن کر چھو نہیں جاتیں؟

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا

تری گل سے نہ جلتے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ دوستی تو خیر اب نسیبِ دشمنان ہوئی

وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چند گیا

تو جیسے مرے پاس ہے اور مجھ کو سخن ہے

مخمل سی جما دیتی ہیں اکثر تری یادیں

پھر ناصر کے نزدیک تو ہے۔

ذرا سی بات سہی تیرا یاد آ جانا

ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی تھی

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر

سر پر خیالی یار کی سپا در ہی لے چلیں

عشقیہ شاعری کی بنیاد اگر ان ”معمولی معمولی“ باتوں پر نہ ہو تو عشقیہ شاعری کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ یاد رکھتے کہ ناصر کا عشق مولانا روم اور علامہ اقبال کے عشق سے سراسر مختلف عشق ہے۔ یہ میر اور مصحفی، مومن اور فراق کا عشق ہے اور اس عشق کی بنیاد نہایت نازک و معمولی؟ جذبات و احساسات پر ہی ہوتی ہے۔ عشقیہ شاعری کرنے والے کا تو کمال ہی یہ ہے کہ وہ ان جذبات و احساسات کو زبان دیتا ہے اور جب وہ بولتا ہے تو پوری نوبت انسانی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ناصر نے اسی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ کیا ناصر کی یہ سوچ ہم سب انسانوں کی سوشل نہیں ہے؟

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد : آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

آئیے اب یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ناصر کی غزل نے نئی نسل کو کس طرح متاثر کیا۔ بات یہ ہے کہ ناصر کی باتیں بظاہر قدیم طرز میں تھیں لیکن ان کے مفہوم میں آج کا زمانہ بولتا تھا۔ اس لئے آج کے نوجوان انہیں اپنی ہی باتیں سمجھتے تھے۔ پوری جدید اردو غزل میں ناصر کا رنگ اور لہجہ نمایاں ہے۔ اسی لئے فتح محمد مالک یہ کہتے ہیں :-

” احمد ندیم قاسمی کا طرز فکر اور ناصر کا نظم کا طرز احساس غنیمت ہے کہ ان کے دم سے نئی

اردو غزل کا وقار زندہ ہے۔ یوں ہماری موجودہ غزل نے جن جن روشن میناروں کی کرنوں میں راہیں پائیں۔ ان میں فراق، نسیم اور ندیم کے ساتھ ناصر کا مینار غزل بھی شامل ہے بلکہ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جو دوسرا مدرسہ فکر یا طرز فکر چل رہا تھا۔ اس کے واحد نمائندہ غزل گو ناصر ہی ٹھہرتے ہیں۔ ان کی انفرادیت کے سچے جذبات، ان کی صحیح سوشل نے نوجوان نسل کو بہت متاثر کیا۔“

انفرادی لحاظ سے اگر احمد فراق کو ناصر کا نظم کے فن کا صحیح وارث قرار دیا جائے تو

بے جا نہ ہوگا جس طرح ناصر نے میر سے اقبال و فراق تک غزل کی روایت کی سب روشنیاں اپنے اندر جذب کر لی تھیں۔ بعینہ احمد مشتاق نے بھی غزل کی اس روایت کا احترام کیا ہے اور اس روایت میں ناصر کاظمی کو شامل کر کے اسے قبول کیا ہے۔ احمد مشتاق، ناصر کاظمی سے ذرا بعد کا شاعر ہے اس لئے احمد مشتاق کے ہاں ناصر کے مقابلے میں عصری ردیوں اور جدید محسوسات کی جھلکیاں زیادہ ہیں اور الفاظ کے چناؤ میں بھی اس نے ناصر سے زیادہ اجتہاد سے کام لیا ہے، ورنہ ناصر کے رنگ غزل کا صحیح انعکاس احمد مشتاق کے ہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس طرح ظفر اقبال کے دو عروج کی غزل میں بھی ناصر شعر شعر سے جھانکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں ظفر اقبال لسانی تشکیلات کے چکر میں پھنس کر اپنا بہت کچھ گنوا بیٹھا، شکیب جلالی بھی ایک ایسا غزل گو ہے جس کے ہاں فراق اور ناصر کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر شکیب، فراق و ناصر کے علاوہ ندیم سے بھی متاثر ہے اس لئے اس کے ہاں دونوں ردیوں کا ایک دلاؤ نیز توازن ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ شکیب کے علاوہ متعدد دوسرے شعرا ہیں جو ناصر کے لہجے میں شعر کہتے ہیں، بلکہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنا بنا بنا یا لہجہ ترک کر کے ناصر کا لہجہ شعوری طور پر اپنا لیا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ناصر کا لہجہ اپنانے کے لئے اس کا سمازاج، زندگی کے بارے میں اس کا سادہ بھی تو درکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ناصر، میر کے لہجے میں غزل کہنے میں کامیاب رہے، اسی طرح صرف احمد مشتاق ہی ناصر کے لہجے میں غزل کہتے محسوس ہوتے ہیں۔

مگر یہ انفرادی مثالیں تھیں۔ دراصل کسی بڑے شاعر کے اثرات غیر محسوس انداز میں اپنا عمل جاری رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے دھوپ پھولوں میں نفوذ کرتی ہے اور خوشبو ہوا میں تحلیل ہوتی ہے۔ ناصر کی غزل کے اثرات بھی بظاہر اسی طرح غیر محسوس ہیں، مگر جس طرح خوشبو گواہی دیتی ہے کہ کہیں پھول کھلا ہے، اسی طرح جدید اردو غزل میں زریاں اور اسیاں، مظاہر فطرت سے دھسپیاں، چڑیاں اور کبوتر، گھاس کی پتیاں اور درختوں کی ٹہنیاں جس

طرح گھر کئے جا رہی ہیں، اور ساتھ ہی عشق کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے سمجھانے کی جو ایک لہر چلی ہے، وہ اس حقیقت کی نماز ہے کہ یہ سب شعائیں اس آفتاب سے پھوٹ رہی ہیں جس کا نام ناصر کاظمی ہے۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن جب بھی کوئی نیا شاعر غزل لکھنے بیٹھے گا وہ میر و مصحفی، غالب و مومن، اقبال و ذراق اور فیض و ندیم کے علاوہ ناصر کی غزل سے بھی پچ کر نہیں نکل سکے گا۔ پھر ناصر کی غزل میں ان سب بڑے غزل گو شعرا کی خوبیوں کے امتزاج کے علاوہ خود ناصر کے انفرادی اسلوب نظر اور اسلوب فن کی نشان دہی باسانی کی جا سکتی ہے، چنانچہ ناصر کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔ جدید ہے کہ باغی قسم کے نوجوان غزل گوؤں کے ہاں بھی ناصر جبکہ بول اٹھتے ہیں، وہ اس کی طرف یہ ہے کہ ناصر کی غزل میں جو نرمی اور اُرد اسی اور ایک باشعور قسم کی سپردگی ہے، وہ اُرد و غزل کی بہترین روایات کا نچوڑ ہونے کے علاوہ عصری رویے کی بھی ترجمان ہے۔ یوں نئی نسل کو ناصر سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور اسی لئے ناصر جو جدید غزل میں خوشبو کی طرح نفوذ کئے جا رہے ہیں آنے والی نسلوں کی بھی امانت بنتے جا رہے ہیں اور ان کی اس پیش گوئی کی صحت کے ثبوت ابھی سے ہیا ہو رہے ہیں کہ:-

بہر دور کی غزل میں میرا نشان ملے گا

ناصر کا یہ کارنامہ آئندہ صدیوں تک یادگار رہے گا کہ انہوں نے میر و غالب کی غزل کو، جو دشمنوں کے پے در پے واروں کی تاب نہ لا کر خاک پر تڑپ رہی تھی، آہستہ سے اٹھایا، اُسے جھاڑا پونچھا، اسے بنایا سنوارا اور جب وہ اس مجرب کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنے معاشرے میں داخل ہوئے تو لوگ غزل کے اس نئے انداز سے نکلے ہوئے حُسن پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے اس فریفتگی کا ایک ثبوت جدید اُرد و غزل ہے جس نے غزل کے امکانات کے اُفق کہیں سے کہیں تک پھیلا دیئے ہیں۔ پاکستان میں تو ناصر مقبول ہیں ہی کہ

ان کی شاعری پاکستان ہی کی پیداوار ہے، مگر ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے غزل گوؤں کو تو ناصر نے جیسے فتح کر لیا تھا۔ وہاں فراق کے بعد کوئی فیض اور ندیم نہیں پیدا ہوتے اس لئے ہندوستان کے شعراء نے فراق کے پہلے کی گونج چند خوبصورت اضافوں کے ساتھ ناصر ہی محسوس کی اور گزشتہ کئی برس سے وہاں جو غزل کہی جا رہی ہے، وہ سراسر ناصر کے فیضان کی نماز ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ناصر حدود و ثغور سے بلند ہوتے جا رہے ہیں اور وہ وقت قریب ہے جب انہیں عالمی سطح پر ایک بڑا شاعر تسلیم کر لیا جائے گا۔

کتابیات

- | | |
|----------------------|--|
| نامہ کاظمی | ۱ - برگ بنے (مجموعہ کلام) |
| " | ۲ - دیوان (مجموعہ کلام) |
| " | ۳ - پہلی بارش (غیر مطبوعہ غزلیں) |
| " | ۴ - امریکی سوسائٹی (ترجمہ) |
| " | ۵ - ڈائریاں (غیر مطبوعہ) |
| ڈاکٹر عبادت بریلوی | ۶ - جدید شاعری (تنقیدی مضامین) |
| " | ۷ - غزل اور مطالعہ غزل (تنقیدی مضامین) |
| " | ۸ - روایت کی اہمیت (" ") |
| ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | ۹ - غزل اور متغزلین (" ") |
| ڈاکٹر یوسف حسین خاں | ۱۰ - اردو غزل |
| الطاف حسین حالی | ۱۱ - مقدمہ شعر و شاعری |
| ڈاکٹر اعجاز حسین | ۱۲ - اردو ادب آزادی کے بعد |
| ڈاکٹر سید عبداللہ | ۱۳ - اردو ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء) |
| ڈاکٹر وزیر آغا | ۱۴ - تنقید و احتساب |
| ڈاکٹر محمد حسن | ۱۵ - ادب و تنقید |
| سجاد باقر ضوی | ۱۶ - تہذیب و تخلیق |
| خلیق ابراہیم | ۱۷ - اردو غزل کے پچیس سال |
| فیض احمد فیض | ۱۸ - میزان |

فراق گورکھپوری
 انتخاب ظ. انصاری
 محمد ہادی حسین
 فتح محمد ملک
 ڈاکٹر حنیف فوق
 انیس ناگی
 by Coombs
 by Murrey
 میر تقی میر
 اسد اللہ خاں غالب
 مرزا داغ دہلوی
 اکبر الہ آبادی
 علامہ محمد اقبال
 " "
 حسرت موہانی
 اصغر گوٹروی
 " "
 فانی بدایونی
 جگر مراد آبادی
 " "
 یاس یگانہ کھنوی

۱۹۔ اندازے
 ۲۰۔ ۵۳ کا بہترین ادب
 ۲۱۔ مغربی شعریات
 ۲۲۔ تعصبات
 ۲۳۔ مثبت قدریں
 ۲۴۔ تنقیدِ شعر
 Literature and Criticism - ۲۵
 The Appreciation of Poetry - ۲۶
 ۲۷۔ کلیاتِ میر
 ۲۸۔ دیوانِ غالب
 ۲۹۔ متبابِ داغ
 ۳۰۔ کلیاتِ اکبر
 ۳۱۔ بالِ جبریل
 ۳۲۔ بانگِ درا
 ۳۳۔ کلیاتِ حسرت
 ۳۴۔ سرودِ زندگی
 ۳۵۔ نشاطِ روح
 ۳۶۔ باقیاتِ فانی
 ۳۷۔ آتشِ گل
 ۳۸۔ شعلہٴ طور
 ۳۹۔ گنجینہ

فراق گورکھپوری

”

احمد ندیم قاسمی

”

”

فیض احمد فیض

”

ظہیر کاشمیری

قتیل شفائی

ظفر اقبال

شکیب جلالی

۴۰ - شعلہ ساز

۴۱ - شبنستان

۴۲ - جلال و جمال

۴۳ - شعلہ نگل

۴۴ - دشتِ وفا

۴۵ - نقشِ فریادی

۴۶ - دستِ صبا

۴۷ - عظمتِ آدم

۴۸ - گجر

۴۹ - آبِ رواں

۵۰ - روشنی اے روشنی!

رسائل، اخبار، انٹرویو

سانچہ نمبر ۱۹۴۴ء، اپریل مئی ۱۹۵۵ء۔

نومبر ۱۹۵۵ء - دسمبر ۱۹۶۱ء، اکتوبر ۱۹۶۲ء۔

نومبر ۱۹۶۲ء - دسمبر ۱۹۶۲ء

۱۹۶۰ء

سانچہ نمبر ۱۹۶۸ء

۱۴ دسمبر ۱۹۶۹ء

مارچ ۱۹۷۳ء

خاص نمبر ۱۹۶۶ء

اپریل ۱۹۷۲ء

۱ - ادب لطیف

۲ - افکار

۳ - الشجاع

۴ - امروز، روزنامہ

۵ - اوراق

۶ - خیابان

۷ - راوی

سانامہ جنوری فروری ۱۹۵۲ء شمارہ ۱۹۵۳ء	۸ - ساقی
جدید نظم نمبر شمارہ ۷ - ۸	۹ - سوغات
شمارہ ۱۷-۱۸، شمارہ ۱۹-۲۰-۲۱	۱۰ - سویرا
سانامہ، شمارہ ۲	۱۱ - سیب
فروری ۱۹۵۱ء، دسمبر ۱۹۵۹ء، جون ۱۹۶۰ء	۱۲ - شاہراہ
شمارہ ۱۹۴۷ء	۱۳ - شاہکار
غزل نمبر ۱۹۶۹، اپریل مئی ۱۹۷۲ء	۱۴ - فنون
جون جولائی ۱۹۷۲ء	
۱۹۷۲ء، اپریل ۱۹۷۳ء	۱۵ - کتاب
دسمبر ۱۹۷۲ء، جنوری ۱۹۷۳ء	۱۶ - لفظ
جنوری ۱۹۷۳ء، شمارہ ۶-۷	
مئی ۱۹۵۲ء، اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء	۱۷ - ماحول
جون ۱۹۶۰ء، شخصیات نمبر ۱۹۴۱ء	۱۸ - نقوش
جنوری سنروری ۱۹۴۲ء	
سانامہ ۱۹۶۵ء، سانامہ ۱۹۶۷ء	۱۹ - نگار
فکر جدید نمبر نومبر ۱۹۶۶ء، شاعر نمبر	۲۰ - نئی قدیں
شمارہ ۴، ۱۹۶۷ء	
شمارہ ۷-۸	۲۱ - نیا دور
غزل نمبر ۱۹۶۹ء	۲۲ - نیرنگ خیال
اکتوبر ۱۹۵۵ء	۲۳ - ہمایوں

ٹی وی انٹرویو ————— ناصر کاظمی سنروری ۱۹۷۲ء
 انٹرویو لینے والے ————— انتظار حسین

ناصر کاظمی شخصیت اور فن

زیر نظر کتاب ناصر کاظمی پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے البتہ شائع ہونے کے لحاظ سے اس کا نمبر چوتھا ہے۔ اس میں ناصر کی زندگی اور شاعری کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ناصر کی شاعری کے بارے میں جو نقطہ نظر ناہید قاسمی نے پیش کیا ہے، اُس پر ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ ایک ترقی پسند شاعر اور ادیب کی بیٹی کا یہی نقطہ نظر ہو سکتا تھا۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ جو باتیں ناصر کی شاعری میں ناہید نے دیکھیں وہ ایک ترقی پسند مصنف کی بیٹی یا شاگرد ہی کو نظر آ سکتی تھیں۔ ناہید اپنی رائے کے اظہار میں اگرچہ بہت Assertive ہیں لیکن دوسروں کی آراء کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتیں، اُن کا تجزیہ کرتی ہیں اور پھر اپنی بات دلائل کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھتی ہیں اور حتمی فیصلہ اُن پر چھوڑ دیتی ہیں۔

اور ایک بات جو اس کتاب کے علاوہ کسی بھی کتاب یا مضمون میں نہیں ملے گی، وہ ہے ناصر کاظمی کی نظم و نثر پر سیر حاصل تبصرہ۔ چونکہ یہ کتاب ابتدائی طور پر ایک تحقیقی مقالہ کی صورت میں لکھی گئی اور اس وقت ناصر کا مکمل کلام اور نثری تحریریں کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئیں تھیں، اس لیے ناہید کا یہ خیال درست ہے کہ ناصر پر مستقبل میں چاہے جو کچھ بھی لکھا جائے لیکن اس موضوع پر ”حرف آغاز“ کا اعزاز انہی کے حصے میں آیا۔

ناصر سلطان کاظمی